سلسلہ مطبوعات نمبر ۵۲

اسلام کا نظریۂ جہاد

حیدر زمان صدیقی

کتاب منزل۔ لاہور

فہرس

تمہیدی کلمات

اقوام دنیا کا اندازِ فکر کچھ اس طرح بدل چکا ہے، کہ ان کے لیے قومی یا جماعتی تصورات سے بلند ہو کر انسانیت مطلقہ کے عمومی نقطۂ نگاہ سے سوچنا ناممکن ہو گیا ہے۔ چنانچہ آج دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جن کا اجتماعی شعور خود ساختہ اور مصنوعی حدود و قیود کا پابند نہ ہو۔ اور وہ ہمہ گیر اصول انسانیت اور غیر متبدل ابدی حقائق کی روشنی میں ہر چیز کا جائزہ لینے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتے ہوں۔

جرمنی کا باشندہ اگر کسی مسئلہ پر غور کرنے لگتا ہے، تو دفعتہ جغرافی حدود میں گھری ہوئی جرمن قوم کا مفاد اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ ترتیب مقدمات اور اخذ نتائج کے دوران میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا ذہن اس تاثر سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح ایک برطانوی یا امریکی یا ہندوستانی کے لیے قطعاً ممکن نہیں ہے، کہ وہ اپنی اپنی قومیتوں سے قطع نظر کر کے نفس انسانیت کو مدار بحث و نظر قرار دے، کیونکہ ان کی ذہنی ساخت ہی کچھ اس طرح کی محدود اور گھٹی ہوئی ہے کہ انسانی برادری

کا وسیع تصور اس میں سما ہی نہیں سکتا

جماعتی تنگ نظری کا یہ حال ہے، کہ ایک پولیٹیکل جماعت کے سامنے جب کوئی سوال پیش ہوتا ہے، تو اس پر غور کرنے وقت وہ اپنے مخصوص جماعتی منشور (یعنی فسٹو) اور طبقاتی مفاد سے ایک انچ بھی ادھر ادھر جانا پسند نہیں کرتی، خواہ اس کے اس طرز عمل سے دوسرے انسانی طبقوں کو کتنا ہی شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، ظاہر ہے، کہ اس طرح کے خود غرضانہ اور حزبی طریق فکر سے نوع انسانی کی بہتری اور نجات ہرگز ممکن نہیں ہے،

یہ ایک عام نفسیاتی حقیقت ہے، کہ جب آپ کسی شخص کو اپنا حریف اور مقابل سمجھ کر اس کے متعلق اپنی رائے قائم کرنا چاہیں، تو اس کی ہر اچھی ادا آپ کی نظر میں قابل نفرت ہو گی، چنانچہ غیر مسلم اہل فکر کا یہی حال ہے، کہ جب وہ کسی اسلامی مسئلہ پر غور کرنے لگتے ہیں، تو پہلے اسلام کے ماننے والوں کو دوسری محدود اور جامد قومیتوں کی مانند ایک قومیت فرض کر لیتے ہیں، اور اسلام کو اس قومیت کا مذہب قرار دیتے ہیں، اب اس مفروضہ کی بنا پر جب وہ اسلامی مسائل کا جائزہ لیتے ہیں تو اسلام کی ہر چیز سے ان کو وحشت محسوس ہونے لگتی ہے، اور ان لوگوں نے اسلام کو ایک ہمہ گیر انسانی مذہب اور غیر محدود فلسفہ زندگی کی حیثیت سے کبھی دیکھا ہی نہیں، ورنہ وہ اسلام کے متعلق اتنی بڑی گمراہی میں نہ پڑتے،

مسئلہ جہاد کی غلط تعبیر

اسلامی مسائل میں جہاد کو ایک اہم درجہ حاصل ہے، مگر غیر مسلم ارباب نظر نے جس طرح دوسرے اصول و احکام اسلامی کی غلط تعبیر کی ہے جہاد کے ساتھ بھی انھوں نے ایسا ہی سلوک کیا ہے، بلکہ سب سے زیادہ جہاد ہی کو انھوں نے ہدف ملامت بنایا ہے، گویا جہاد ان کے حصار قومیت کے لیے ایٹم بم کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ ان لوگوں نے جہاد کی نسبت جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے:۔

(۱) جہاد ایک وحشیانہ قومی جنگ ہے جو ایک مخصوص قوم کے اقتدار و سیاست کے لیے لڑی جاتی ہے، اور اس کی تہہ میں وہی جذبہ کارفرما ہے جو عام سیاسی اور معاشی جنگوں میں پایا جاتا ہے، یعنی جہاد بھی ایک معاشی اور سیاسی جنگ ہے، اور اس کے ذریعہ مسلم قوم کا معاشی اور سیاسی اقتدار قائم کرنا مقصود ہے

(۲) جس طرح دوسری قومی جنگوں کا نتیجہ یہ ہے کہ غالب اقوام مفتوح اقوام پر تسلط پانے کے بعد ان کو اپنے مخصوص آئین سیاست پر چلنے دیتی ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے جہاد ملی کا مقصد بھی یہی ہے، کہ دوسری اقوام پر غلبہ پانے کے بعد ان کو اسلامی نظام سیاست کا پابند بنا دیا جائے،

(۳) اسلام کسی غیر مسلم کو زندہ رہنے کا حق نہیں دیتا، اور جہاد کا مطلب ہی یہ ہے، کہ جو بھی غیر مسلم نظر آئے، اس کو قتل کر دیا جائے اور اسلام

کی بارگاہ سے۔ صرف اسی کو زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے جو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے، یا اپنی جان و مال اور عزت و ناموس مسلمانوں کے حوالے کر دے، اور خود بے ننگ و نام (ذمی) ہو کر زندگی بسر کرے۔

یہ ہیں وہ تصورات جو غیر مسلم اہل نظر نے جہاد کی نسبت قائم کیے ہیں اور جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، کہ جہاد کی سراسر غلط اور گمراہ کن تعبیر کا اصل سبب یہ ہے، کہ یہ لوگ اسلام اور جہاد کے اصلی مقام و موقف سے بے خبر ہیں، اور ان کو معلوم نہیں ہے، کہ اسلام کسی ایک جغرافی یا نسلی قوم کا مذہب نہیں ہے، بلکہ یہ انسانیت عامہ کا مذہب ہے، اور جہاد اس ہمہ گیر خدائی فلسفہ زندگی کے قیام و نفاذ کی مقدس جد و جہد کا نام ہے، یعنی جہاد اسلامی سے مقصود یہ ہے، کہ خدا کی زمین کو شورش و بدامنی اور فتنہ و فساد سے پاک کیا جائے، حاکم و محکوم، بندہ و آقا، اور اعلیٰ و ادنیٰ کے تمام مصنوعی امتیازات مٹائے جائیں، اور "ان الحکم الا للہ" کی ابدی حقیقت کو بروئے کار لایا جائے۔

اگر اس حیثیت سے مسئلہ جہاد کا جائزہ لیا جائے، تو اس بات کے سمجھنے میں ہرگز دقت نہ ہوگی، کہ جہاد وہ عظیم الشان اور مقدس انسانی عمل ہے، جس سے دنیا کے تمام انسانوں کو ایک ہمہ گیر رشتۂ اخوت میں منسلک کیا جا سکتا ہے، صدیوں کی نسلی اور قومی رنجشیں مٹ سکتی ہیں، اور انسانیت کو امن و راحت، نشاط و الم اور عیش مسلسل کا وہ اعلیٰ مقام مل سکتا ہے جس کے

آج سے کچھ عرصہ قبل اقوام دنیا کو کسی بین الملی قانون (لا آف انٹرنیشنل لا) اور ضابطہ جنگ کا علم ہی نہ تھا مگر جنگ کی بڑھتی ہوئی ہیبت ناکیوں اور انسانی نسل کشی کی خطرناک رفتار ترقی نے ان اقوام کو مجبور کیا، کہ وہ اسباب جنگ کی روک تھام کے لیے موزوں قدم اٹھائیں، اور ناگزیر حالت کے لیے جب کہ جنگ کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے، ایسا قانون بنائیں جس سے کم از کم انسانی جان و مال کا نقصان ہو، چنانچہ اس مقصد کے لیے بین الملی قانون ترتیب دیا گیا، مگر مشکل یہ ہے، کہ صرف قانون کی ترتیب و تدوین سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، تاوقتیکہ اس قانون کی پشت پر کوئی تنفیذی طاقت موجود نہ ہو، مگر اقوام حاضرہ کا قانونِ جنگ روز اول ہی سے اس طاقت سے محروم ہے، یہی وجہ ہے، کہ خود قانون بنانے والے اس قانون کو اس طرح رسوا کرتے رہے ہیں، کہ الامان! الامان!!

مگر جہاد اسلامی کی خصوصیت یہ ہے، کہ وہ ہر حال میں اسلامی ضابطہ جنگ کا ساتھ دیتا ہے، اور مسلمانوں کی قوتِ ایمانی اس قانون کے نفاذ و اجرا کی ضامن ہے،

اسلام کی سیاست خارجہ کی اساس جنگ و قتال پر ہے یا صلح و امن اور عالمگیر جذبہ اخوت پر؟ نیز دعوت اسلامی میں جہاد کا اصلی موقف کیا ہے؟ جہاد کے ضمن میں ان مباحث کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

اور زیر نظر کتاب میں ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے

جہاد ایک فریضہ الٰہی ہے، اور اس کا قیام ملت کے بقا اور انسانیت کی حقیقی خدمت کے لیے از بس ضروری ہے۔ اس کی ضرورت و اہمیت کسی وقت اور مصلحت کی محتاج نہیں ہے۔ بلکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اقدس کے مطابق تا قیام قیامت اس فریضہ کو جاری رہنا چاہیے۔ لایزال طائفۃ من امتی یقاتلون علی الحق (ابوداؤد)

اور اس اہم فریضہ اسلامی کی انجام دہی میں کوتاہی کرنا اتنا بڑا جرم ہے، کہ خداوند قدوس اس کو ہرگز معاف نہیں کرتا۔ الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما و یستبدل قوما غیرکم (التوبہ)

ملت اسلامیہ کی حیات اجتماعیہ میں جہاد کا مقام اور فرائض اسلامی میں جہاد کا مرتبہ کیا ہے؟ کتاب میں ان مسائل پر بھی تفصیلی بحث کیا گیا ہے

میں جانتا ہوں، کہ بہت سے اہل قلم نے مسئلہ جہاد پر کتابیں لکھی ہیں اور ان میں کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں جو بلا شبہ انتہائی محنت اور قابلیت سے لکھی گئی ہیں، مگر میں نے زیر نظر کتاب میں ان مباحث کی طرف بہت کم تعرض کیا ہے جو ان کتابوں میں آ چکے ہیں

قیام پاکستان کے بعد ملت پاکستان پر جو اہم ذمہ داریاں آپڑی ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی ایک ہی صورت ہے کہ افراد ملت میں سے جو کسی کام کی صلاحیت رکھتا ہو وہ انتہائی دیانت، خلوص اور محنت سے اس کو انجام دے۔ میں نے اسی پرخلوص جذبے کے تحت یہ کتاب لکھی ہے اور مجھے امید ہے کہ ملت پاکستان میری اس حقیر کوشش کو شرف قبول بخشے گی

وما توفیقی الا باللہ!

حمید الزمان صدیقی

ہری پور ہزارہ

اقوامِ عالم کی تاریخ حرب کا نظریاتی پس منظر

ماضی اور حال کی تاریخ حرب، قتل و غارت، جبر و قہر، غضب و نہب اور
عالمگیر فتنۂ انسانیت کی ایسی المناک داستان ہے کہ اس کے تصور کے
ساتھ ہی لاشوں کے پشتے، خون کی ندیاں، آگ کے مہیب شعلے، دھوئیں
کے بادل، راکھ کے ڈھیر، عورتوں اور بچوں کی چیخ پکار اور انسانی قساوتِ قلبی
کے لاتعداد خوفناک مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور اس سلسلہ
میں ماضی اور حال کی تاریخ کو اس طرح باہم ملا دیا ہے اور آج تک جتنا کچھ
آپ ماضی کی داستانوں میں پڑھ سکتے ہیں حال کے مشاہدہ سے بھی
آپ وہی کچھ پائیں گے۔ یہی تاریخ کا دور غارت گرانِ انسانیت کی خون
آشامیوں اور ہلاکت آفرینیوں پر ماتم کناں ہے۔ اور انسانیت معصوم سر
روئے زمین مرغ بسمل کی طرح تڑپتی نظر آتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تاریخ

انسانی کا یہ باب اتنا بھیانک، اتنا خوفناک اور اتنا شرمناک ہے، کہ اس کے تصور ہی سے جگر شق ہونے لگتا ہے، اور سر ندامت سے جھک جاتا ہے،

جہاں تک امم سابقہ کا تعلق ہے، قرآن حکیم کے بیان کردہ تذکرۂ امم میں بہت سے ایسے حقائق کا پتہ چلتا ہے جن سے زمانۂ قدیم کی روش جنگ اور داعیہ ہائے قتال کا انکشاف ہو سکتا ہے، اور اس کے علاوہ کتب تاریخ اور آثاری اکتشافات سے بھی ایک حد تک ان کا طرز معاشرت، نظام سیاست، طریق جنگ، اور فوجی استحکامات کے نشانات مل سکتے ہیں مگر یہاں ان کے طرزِ معاشرت اور طریق جنگ سے زیادہ ان کے نظریہ ہائے جنگ کی ٹوہ لگانا مقصود ہے، کیونکہ نظام معیشت و معاشرت ہو، یا قانون سیاست و جنگ اس کی تہ میں بلاشبہ وہ ذہنی کیفیت کارفرما ہوتی ہے، جو خارجی نظام کے لیے علت مؤثرہ یا پس منظر و پیک گراؤنڈ کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کی خارجی شکل و ہیئت متعین کرتی ہے،

جہاد اسلامی جن بلند تر مقاصد کا حامل ہے، ان کی عظمت کا حقیقی اعتراف اسی وقت ممکن ہے، کہ اقوام دنیا کے نظریات جنگ، نظر کے سامنے ہوں، اس بنا پر ضروری ہے، کہ ماضی اور حال کے معرکہ ہائے جنگ اور جنگجو اقوام کا پس منظر چند لفظوں میں پیش کر دیا جائے

انسانیت کے ابتدائی دور میں جو سب سے پہلی جنگ تسلیم کی گئی ہے، وہ دو قوموں یا دو جماعتوں کی جنگ نہ تھی، بلکہ دو بھائیوں کی جنگ تھی، اور قرآن

کریم نے اس جنگ کے لیے حسد و رشک کو داعیہ قرار دیا ہے، ایک بھائی حسد کے جنون میں از خود رفتہ ہو جاتا ہے، اور اپنے بھائی کے خون میں ہاتھ رنگنا چاہتا ہے، اور دوسرا بھائی اتنا نیک نہاد، شریف النفس اور اصول پسند ہے کہ وہ اپنے بھائی پر جوابی حملہ کرنے سے بھی گریز کرتا ہے، کہ یہ اس کے نزدیک گناہ عظیم ہے،

لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي	تو اگر مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا
مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ	ہے تو بے شک ایسا کر دیکھ، لیکن میں تیرے
لِأَقْتُلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ	قتل کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا کیونکہ میں
الْعَالَمِينَ (المائدہ ۲۸)	خدائے پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں

یہ وہ زمانہ تھا کہ اب تک کسی نسلی یا جغرافی قومیت کی نبیاد نہ پڑی تھی اور نہ ہی کوئی ملکی تصور معرض وجود میں آیا تھا، بلکہ آدم علیہ السلام کی وفات سے طوفان نوح کے مشہور سانحہ تک کی طویل مدت میں جو کچھ ہوتا رہا، وہ پردہ خفا میں ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا، کہ اس طویل عرصہ میں کوئی باقاعدہ مملکت قائم ہوئی تھی یا نہیں، مگر نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں کی اولاد سے مستقل نسلی اور جغرافی قومیتوں، اور عظیم الشان قومی مملکتوں کی نبیاد پڑتی ہے،

حضرت مسیح سے دو ڈھائی ہزار سال قبل دنیا کی بڑی بڑی اقوام کی نقل و حرکت اور مختلف قوموں کی باہم آویزش کے بہت سے واقعات ملتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ تاریخ انسانی کا یہ دور معاشی کش مکش

قوم کا اصلی مسکن و مولد اگرچہ عرب تھا، مگر عرب میں چونکہ وسائل معیشت کی فراوانی نہ تھی، اس لئے یہ دلیر اور جنگجو قوم عرب سے نکل کر انسانی آبادیوں کو روندتی ہوئی دنیا کے اکثر ممالک پر چھا گئی ان اقوام کا دورِ عروج دو ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے، جب کہ یہ بابل، مصر اور دوسرے ایشیائی ممالک پر حملہ آور ہو کر عظیم الشان حکومتوں کی بنیاد ڈالتی ہیں، چنانچہ ابن خلدون لکھتے ہیں:۔

وکان لھؤلاء الامم ملوک ودول فی جزیرۃ العرب وامتد ملکھم فیھا الی الشام ومصر فی شعوب منھم (تاریخ ابن خلدون جلد ۲ ص۲۰)	ان اقوام میں بہت سے بادشاہ تھے، اور جزیرہ عرب میں ان کی بڑی بڑی سلطنتیں تھیں اور ان کے چند قبائل کی وسعت ملکت مصر و شام تک پہنچ چکی تھی،

قرآن حکیم نے زمانہ قدیم کی جن قوموں کا ذکر کیا ہے، ان کے طرز جہانبانی اور طریق تمدن کو اس رنگ میں پیش کیا ہے، کہ اس میں مدح و حسن کا کوئی پہلو نہیں نکلتا، نیز ان کے ظالمانہ طرز سیاست کے سینکڑوں واقعات کو چند الفاظ میں اس طرح سمیٹ دیا ہے، کہ انسانی ہاتھوں کی لکھی ہوئی تاریخوں کے صدہا دفتر قرآنی زورِ بیان کے سامنے پھیکے نظر آتے ہیں، اور کبھی ان کی معیشت فاسدہ کی تباہ کاریوں کو اسی شان فصاحت کے ساتھ ذکر

لہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (الآیۃ)

کیا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک مقصود بالذات تذکرہ تاریخی
نہیں ہے، بلکہ ان جابر اقوام کے ذہنی پس منظر کو پیش کرنا ہے جس نے ان
کی غلط سیاست کاری و زشت سیرت خاسرہ کو ابھار دیا   چنانچہ عاد کی
کی قوت و شوکت، جاہ و جلال، سیاست، تمرد اور تمدن و تعمیر کے تمام
طریق کو اس طرح بیان کیا ہے

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ
إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ
يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ
(فجر)

آپ نے دیکھا نہیں کہ عاد ارم سے آپ کے
رب نے کیا سلوک کیا، جو بڑی بڑی عمارتوں
والی تھی، اور جن کی مثال ممالک و بلاد میں
نہیں پیدا کی گئی۔

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ
مِنَّا قُوَّةً (حٰمٓ السجدة)

لیکن عاد نے ناحق دنیا میں تکبر
کیا اور کہہ دیا کہ ہم سے بڑھ کر طاقتور
کون ہے؟

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً
تَعْبَثُونَ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ
لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ وَإِذَا بَطَشْتُمْ
بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ۝
(الشعراء)

اے عاد! تم ہر اونچی جگہ پر عبث بے فائدہ
یادگار اور عجیب و غریب مکان بناتے
ہو کہ شاید تم ہمیشہ زندہ رہو گے، اور
جب تم کسی پر گرفت کرتے ہو، تو جابرانہ
گرفت کرتے ہو

لہ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ
تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا (الآية)

ان آیاتِ قرآنی سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے، کہ ان اقوام کا اندازِ فکر اور رجحانِ طبیعت کیا تھا، اور ان کی سیاست و مدنیت کے بنیادی نظریے کیا تھے، نیز دوسرے ممالک پر ان کی فوج کشی، حملہ و ہجوم اور دیار و بلاد پر ان کے غلبہ و استیلاء کے اصل دواعی کیا تھے، اور مفتوح اقوام سے ان کا سلوک کیسا تھا، ذیل میں ہم ان اقوام کے حملہ مصر کا ایک تاریخی حوالہ پیش کرتے ہیں، عہد قدیم کا مورخ "مانیتھو" ان اقوام کے حملہ مصر کے سلسلہ میں رقمطراز ہے:۔

"خدا ہم سے خفا تھا، ایک عجیب طریقہ سے یہ شریر یا لخلقت لوگ اطرافِ مشرق سے چلے آئے، وہ اس قدر بہادر تھے کہ وہ ہمارے ملک میں گھس گئے، نہایت آسانی سے بزورِ قہر کر لیا، گو ان سے ہماری ایک قسمت آزما جنگ ہوئی، جب انہوں نے ہمارے سرداروں کو گرفتار کر لیا، اور اپنی قوت سے ہم پر حکومت کی، انہوں نے ہمارے شہروں کو جلا دیا، ہمارے دیوتاؤں کے ہیکلوں کو برباد کر دیا۔"

(دیکھو ارض القرآن ص ۱۴۶)

امم سامیہ اولیٰ میں سے جو قبائل عرب میں رہ گئے تھے، اور انہوں نے عرب کے شمال میں عظیم الشان مملکت کی بنیاد ڈالی، وہ ثمود کے نام سے مشہور ہیں، قرآن حکیم نے ان کی مرفہ الحال زندگی، شوقِ تعیش اور فساد فی الارض کا ذیل کے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:۔

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ، فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۔ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ (الشعراء)

اور کیا تم اتراتے ہوئے پہاڑوں کو تراش تراش کر کے مکانات بناتے ہو بس تم اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو، اور ان مسرفین کی اطاعت نہ کرو، جو زمین میں فساد کرتے ہیں، اور اصلاح نہیں کرتے،

اقوام سامیہ اولیٰ کے بعد عرب مستعربہ کا دور آتا ہے، جو اصل کے اعتبار سے عرب نہ تھے، مگر عاد اولیٰ کے زیر حکومت رہ کر انھوں نے عربی تمدن اختیار کر لیا تھا، اور بالکل عرب بن گئے تھے، اس طبقہ کا بانی یعرب بن قحطان تھا، اور اس کا پایہ تخت یمن تھا، اس کی نسل سے بہت سے خاندان یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے چنانچہ تبابعہ، سبا اور حمیر کی عظمت شان اور قوت وشوکت کا قرآن حکیم میں کئی مرتبہ ذکر آیا ہے۔

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ

کیا (قوت وشوکت میں) وہ (قریش) بہتر ہیں یا قوم تبع ان سے بہتر تھی،

سبا کے متعلق ارشاد ہے،

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۥ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۝ (سبا)

سبا کے لیے ان کے اپنے مسکن میں نشانی تھی (یعنی) دائیں بائیں دو باغ (جو کئی میلوں تک چلے گئے تھے) ان سے کہہ دیا گیا کہ اپنے رب کا رزق کھاؤ اور اس کا شکر کرو، رہنے کے لیے پاکیزہ شہر ہے اور رب بخشنے والا،

یہ اس قوم کی پہلی حالت تھی جب کہ یہ عزت و جاہ اور وسائل معیشت کی کثرت کے لحاظ سے دنیا کی ممتاز ترین قوم تھی، مگر جب نشۂ دولت و حکومت نے اسے اندھا کر دیا، تو اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پہلے اس کی پیش رو قوموں کا ہوا تھا،

وَظَلَمُوٓا اَنْفُسَہُمْ فَجَعَلْنٰہُمْ اَحَادِیْثَ وَمَزَّقْنٰہُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ (سبا)	سو انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور ہم نے انکو حقیقت سے افسانہ بنا دیا، اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

سبا کے ایک طبقہ نے حبش میں سکونت اختیار کر لی، اور وہاں اس نے باقاعدہ مملکت بھی قائم کر لی تھی، اور آگے چل کر سبا یمن اور سبا حبش میں سخت قبائلی اور نسلی رقابت شروع ہو گئی، چنانچہ خاندانی تعصب کی وجہ سے ان دونوں میں مدتوں جنگ جاری رہی، مگر ایک عرصہ کے بعد سبا حبش نے عیسائیت قبول کر لی، اور سبا یمن نے یہودی مذہب اختیار کر لیا، اور اس طرح ان کی قدیم رقابت دو آتشہ بن گئی، چنانچہ سنۂ ... سے چھٹی صدی تک ان کی باہم لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا

ان لڑائیوں کی تہ میں کون سے دواعی کارفرما تھے؟ اس کا اندازہ ان اقوام کے اعمال جنگ ہی سے کیا جا سکتا ہے یعنی ان کی جنگوں میں نسلی اور قبیلوی تعصب کے علاوہ مذہب کا غلط تصور بھی کارفرما تھا، چنانچہ ایک تاریخی واقعہ ہے، کہ ذو نواس (شاہ یمن) نے نجران کے کچھ عیسائیوں کو آگ کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا، قرآن کریم نے بھی اس واقعہ کو اجمالی طور پر ذکر کیا

سبہ (قتل اصحاب الاخدود النار ذات الوقود) (الآیۃ)
ظاہر ہے۔ کہ ذونواس یہودی تھا، اور مذہب کے غلط تصوّر نے اس کو
اس حرکت پر آمادہ کیا تھا، اس واقعہ نے رومیوں میں سخت ہیجان
پیدا کر دیا، اور انھوں نے کاتب الامیح (شاہ حبش) کو آمادہ کیا، کہ وہ
یمن پر حملہ کرے، آخر ایسا ہی ہوا، کہ شاہ حبش نے یمن پر فوج کشی کی
ذونواس مارا گیا، اور شاہ حبش کا یمن پر بھی اقتدار قائم ہو گیا، مگر مذہبی
تعصب ان میں بھی کچھ کم نہ تھا چنانچہ انھوں نے باشندگان اکسوم کو اس
شرط پر رہائی دی، کہ وہ سب عیسائی ہو جائیں، اب ارباط نامی ایک شخص
یمن کا پہلا گورنر مقرر ہوا، اور اس نے بیس سال تک حکومت کی، مگر آخر ابرہہ
نامی ایک شخص کے ہاتھ سے قتل ہوا، اور ابرہہ جو عیسائی تھا یمن کا مختار مطلق
بادشاہ بن گیا یہی وہ جابر بادشاہ تھا جس نے جناب آقائے دو جہان
(صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی ولادت سے چالیس دن قبل مکّہ معظّمہ پر چڑھائی کی
تھی، قرآنِ کریم میں اصحاب الفیل کے نام سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس
مشہور واقعہ کا اصل محرک خواہ کوئی ملکی اور سیاسی مصلحت ہو، خواہ کچھ اور
مگر اس میں شک نہیں، کہ کعبۃ اللہ کی قدیم تاریخی عظمت اس عیسائی بادشاہ
کے لیے ناقابل برداشت تھی، چنانچہ اسی مقصد کے لیے اس نے صنعاء
میں ایک بہت بڑا کنیسہ تعمیر کرایا تھا جس کا نام اس نے کعبہ رکھا تھا
غرض ان اقوام کا قومی مذاق اور اجتماعی شعور اُمم سامیہ اولیٰ سے کچھ زیادہ
مختلف نہ تھا، اور ان کے مقاصد جنگ بھی کم و بیش ان کے لگ بھگ تھے

البتہ ان میں قبیلوی اور نسلی رقابت کے ساتھ مذہبی تعصب بھی نمایاں نظر آتا ہے،

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں بابل کی ایک مطلق العنان بادشاہت کا پتہ چلتا ہے، جس کا حکمران نہایت متکبر اور مغرور انسان تھا، اس کا دعویٰ یہ تھا، کہ انسانوں کی زندگی اور موت میرے قبضہ اختیار میں ہے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک جابر حکمران مصر کی سلطنت پر قابض نظر آتا ہے، جس نے اپنا ملک غرقی تخت ہزار ہا بے گناہ انسانوں کی لاشوں پر بچھایا تھا۔ قرآن حکیم میں ان حکمرانوں اور ان اقوام کا جن پر یہ حکمرانی کرتے تھے کئی مرتبہ ذکر آیا ہے، اور کہیں کہیں ان کے طرز فکر اور عمل، مسلح و مقصد کا بھی انکشاف کیا ہے، چنانچہ فرعون مصر کی حاکمانہ حکمت عملی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے صاف الفاظ میں کہا ہے، کہ اس کی جدوجہد کا مقصد اپنے فرقہ یا قوم کی سربلندی، دوسرے فرقوں کی تذلیل اور اپنی جھوٹی خدائی کا تحفظ تھا،

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ (الآیۃ)

فرعون نے زمین میں تکبر کیا، وہاں کے رہنے والوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرنا چاہتا تھا،

قرآن حکیم میں بنی اسرائیل کا ذکر بار بار آیا ہے اس قدر بسط و تفصیل کے ساتھ کسی دوسری قوم کے حالات نہیں بیان کیے گئے، جس قدر اس قوم کے بیان کیے گئے ہیں، درحقیقت یہی وہ قوم ہے جس کو یک نعمت نبوت اللہ

حکومت کے جلیل القدر مناصب ایک عرصہ تک حاصل رہے، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا عہد ان کی قومی زندگی کا عہد شباب تھا، اور لطف یہ ہے، کہ حضرت موسیٰ سے لے کر حضرت مسیح تک کے درمیانی عرصہ میں کوئی نہ کوئی اللہ کا بھیجا ہوا نبی ان کے اندر موجود رہا۔ مگر حیرانی کی بات یہ ہے، کہ اس کے باوجود ان کے قومی مزاج اور ملی شعور میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی؛ چنانچہ مصر سے نکلنے کے بعد موسیٰ نے ان کو وہ وعدہ خداوندی یاد دلایا، جو خدائے قدوس نے حضرت ابراہیم سے کیا تھا، کہ میں تیری نسل کو شام و فلسطین میں غلبہ و تمکنت عطا کروں گا، اور پھر موسیٰ نے ان سے جرات و دلیری سے آگے بڑھنے کا مطالبہ کیا، مگر اس قوم نے یہ جواب دیا،

یٰمُوسٰى إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ
وَإِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوا
مِنْهَا فَإِنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا
دَاخِلُونَ (المائدہ ۵)

اے موسیٰ اس سرزمین میں ایک جابر قوم رہتی ہے اور ہم ہرگز اس زمین میں داخل نہ ہوں گے تاوقتیکہ وہ قوم وہاں سے نکل نہ جائے، پس جب وہ وہاں سے نکل جائیں گے، تو ہم اس زمین میں داخل ہوں گے،

ظاہر ہے، کہ انبیاء و رسل کے فلسفۂ زندگی کو ماننے والے لوگ زندگی کا ایک ہی مقصد رکھتے ہیں، جو ان کی جان عزیز سے ہزار درجہ زیادہ ان کی نظر میں عزیز ہوتا ہے،

مقصدے از آسماں بالاترے   دلربائے دلستانے دلبرے

لیکن بنی اسرائیل کا شعور ابھی اس درجہ تک پہنچا ہی نہ تھا، کہ وہ حیات جاوید اور اصول انسانیت کے لیے اپنی جانیں نذران کرتے۔ اور جام شہادت میں اپنے ضمیر مردہ کے لیے حیات تازہ کی تلاش کرتے

من یکن یسرہ ان یلقی الرضوان علیہ ۔ وما یخرجہ بمیت ابدا

تین وحشیانہ حملے

خدائے قدوس نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا، کہ تمہاری معصیت و فساد کی وجہ سے تم پر قہر الٰہی نازل ہوگا، اور تمہاری قومی ہستی کو ختم کر دیا جائے گا، مگر دو مرتبہ تمہیں پھر ابھرنے کا موقع دیا جائے گا

پہلا حملہ وہ ہے جب کہ عمالقہ نے بنی اسرائیل کا سیاسی اقتدار ختم کر دیا تھا، اور ان کو ان کے دیار و اموال سے نکال دیا تھا، چنانچہ ایک جگہ قرآن کریم نے اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے

وَمَا لَنَا اَنْ لَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا (البقرۃ)

ہمیں کیا ہوا ہے، کہ اللہ کی راہ میں ہم نہ لڑیں حالانکہ ہمارے دشمن نے ہم کو گھر بار اور اولاد سے جدا کر دیا ہے۔

دوسرا حملہ بابل کے مطلق العنان بادشاہ بخت نصر کا ہے جب کہ اس کی افواج قاہرہ نے یہود کے مرکز دینی یعنی بیت المقدس پر یلغار کی یہود کا قتل عام کیا، شہر کو ویران کر دیا، یہاں تک کہ ان کے مقدس معابد اور ہیکل سلیمانی کو برباد کر دیا، اور قتل عام سے جو لوگ بچ گئے، ان کو گرفتار کر کے بابل لے جایا گیا، جہاں وہ مدتوں مقید رہے،

تیسرا حملہ شہنشاہ روم ٹیٹس نے بیت المقدس پر کیا تھا، اور یہ حملہ اتنا شدید اور فیصلہ کن تھا کہ اس نے یہود کی ہزار سالہ عظمت قومی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا، اور اس کے بعد وہ سیاسی لحاظ سے کبھی نہ اٹھ سکے۔ یہ سنہ ۷۰ء میں ہوا تھا۔

قرآن حکیم نے پہلے دو حملوں کا صراحت سے ذکر کیا ہے۔ مگر تیسرے حملہ کے متعلق صرف اشارہ پر اکتفا کیا ہے۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي	ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کو بتلا دیا
الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ	یا فیصلہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد
مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا	کرو گے اور پھر بہت بڑی بلندی پر پہنچ جاؤ گے
فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا	پس جب ان دو وعدوں میں سے پہلے وعدہ
عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ	کا وقت آیا تو ہم نے سخت جنگجو لوگوں کو تم
شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ	پر بھیج دیا، پس وہ شہروں کے اندر گھس گئے
وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا	اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہا۔

اس تباہی کے بعد بنی اسرائیل کو پھر سیاسی اقتدار حاصل ہوا ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ (الآیۃ)، پھر جب دوسرے وعدے کی تکمیل کا وقت آیا، تو ایک دوسری قوم نے حملہ آور ہو کر قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا	پس جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو ہم
وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ	نے دوسرے لوگوں کو بھیج دیا کہ تمہارے

كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ؕ (بنی اسرائیل)

چہروں کو بگاڑ دیں اور مسجد میں داخل ہو جائیں جیسے پہلی دفعہ داخل ہو گئے تھے، اور وہ جس پر غلبہ پائیں اس کو برباد کر دیں

اس دوسری آزمائش کے بعد ایک دفعہ پھر ان کو عظمت قومی سے سرفراز کیا گیا لیکن وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (الآیۃ) کے الفاظ سے ایک تیسری شدید آزمائش کی طرف اشارہ کر دیا گیا چنانچہ اس تیسرے تنزل کے بعد بنی اسرائیل کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اور آج تک دنیا کے کسی خطہ میں ان کو سرفرازی حاصل نہ ہو سکی، اگرچہ آج بیسویں صدی کی دول مغربیہ یہود کے قومی وطن (ہوم لینڈ) کی تعمیر میں نہایت خطرناک پارٹ ادا کر رہی ہیں، مگر یہ بات حیران کن ہے کہ وہ ابھی تک مسلسل ریشہ دوانیوں کے باوجود اس میں کامیاب نہیں ہو سکیں اور نہ ہوں گی۔

ان حملہ آور اقوام کے جارحانہ حملوں اور سفاکیوں کے حالات کتب تاریخ و سیر میں ملتے ہیں، اور ان کے حربی کارناموں کا ذہنی پس منظر معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، کہ ان کی جد و جہد اور حملہ و ہجوم کا مقصد قومی عظمت و سیادت کا حصول تھا یعنی نسلی اور قومی برتری کا احساس ہی ان کو جنگ پر آمادہ کرتا تھا، اور مذہب کی غلط پیروی نے ان کے اعمال جنگ میں اور بھی وحشت و بربریت پیدا کر دی تھی،

روما و فارس

بعثت نبوی کے وقت دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتیں یعنی فارس اور روما الگ الگ مذہب و تہذیب کی علمبردار

تھیں اور دونوں حکومتوں میں وطنی قومی اور مذہبی تعصب نے شدید جذبہ منافرت پیدا کر دیا تھا، چنانچہ ظہور اسلام سے قبل اور بعد ایک عرصہ تک ان میں باہم جنگ و قتال کا سلسلہ جاری رہا، مگر ان کے تعصب تو ہینت نے کچھ ایسی بھیانک شکل اختیار کر لی تھی، کہ یہ لوگ حملہ و ہجوم کے وقت مذہب اور اخلاق و شرافت کے تقاضوں کو بالکل بھول جاتے تھے، اور دشمن کی تذلیل و توہین بلکہ اس کے شعائر مذہب کی تحقیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے، چنانچہ خسرو پرویز نے جب فلسطین پر حملہ کیا، تو اس نے سب سے پہلا جو کام کیا وہ یہ تھا کہ عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو نذر آتش کیا، اور نوے ہزار عیسائیوں کو قتل اور گرفتار کیا، اسی طرح ہرقل نے شمال کی طرف سے ایران پر حملہ کیا، تو اس نے بھی سب سے پہلے مجوسیوں کے آتش کدوں کو برباد کیا، اور ہزاروں انسانوں کا خون بہایا

حقیقت ہے، کہ تاریخ انسانی کا یہ دور مذہبی جنون اور قومی تعصب کا ایک بدترین دور تسلیم کیا گیا ہے، اور اس کی مثال انیسویں اور بیسویں صدی کی ہولناک جنگوں کو چھوڑ کر شاید ہی پوری انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے دستیاب ہو سکے گی، چنانچہ عیسائیت اور یہودیت کی باہم مذہبی منافرت کا نتیجہ تھا، کہ اس دور میں عیسائی سلطنتوں کے ہاتھوں یہودیوں کو جن لرزہ انگیز مظالم کا شکار ہونا پڑا ان کا تصور بھی ایک انصاف پسند انسان کے لیے سخت مشکل ہے، بلکہ خود عیسائیوں کا یعقوبی فرقہ برسر اقتدار فرقہ کے مظالم سے چلا اٹھا تھا، اور یہی وجہ تھی، کہ خدا کی اس مظلوم ترین مخلوق نے

اسلامی فاتحین کا جوشِ مسرت سے استقبال کیا، اور مسلمانوں کے ساتھ ہو کر اپنے ہم مذہب عیسائیوں سے لڑائی کی چنانچہ قاضی ابو یوسف اپنی مشہور عالم کتاب "کتاب الخراج" میں تحریر فرماتے ہیں،

فلما رای اھل الذمۃ وفاء المسلمین وحسن السیرۃ فیہم صاروا اشداء علی عدو المسلمین وعونا علی اعداھم	جب ذمیوں نے مسلمانوں کا ایفاءِ عہد اور حسن اخلاق دیکھا، تو وہ اعدائے مسلمین کے مقابلہ میں مسلمانوں کے معاون و مددگار بن گئے۔

عرب جاہلیت کے تصوّراتِ جنگ

اسلام کا ظہور سب سے پہلے عرب میں ہوا۔ اور عربوں ہی کے ذریعہ یہ دنیا میں پھیلا، اس لیے یہ دیکھنا از حد ضروری ہے، کہ جن لوگوں نے قبول اسلام کے بعد پوری دنیا میں ایک ہمہ گیر ذہنی اور سیاسی انقلاب پیدا کیا، وہ اسلام لانے سے قبل کیا تھے؟ یعنی ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں کس نوعیت کی تھیں، اور جنگ قتال کے سلسلہ میں ان کے نظریئے کیا تھے، اور اسلام کے بعد ان کے تصورات حرب اور شعور ملی میں کس طرح کی تبدیلی رونما ہوئی؛

جہاں تک بعد از اسلام ان کے نظریہ زندگی اور تصورِ حرب کا تعلق ہے، وہ کتاب و سنت سے معلوم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کی پوری زندگی پر کتاب اللہ اور سنت نبوی کا رنگ چھایا ہوا تھا، چنانچہ آیندہ مباحث میں ان پر تبصرہ کیا جائے گا، لیکن اس موقعہ پر عرب جاہلیت کے تصورات

جنگ معلوم کرتے ہیں۔

عرب جاہلیت میں فنِ تاریخ کا رواج نہ تھا یہی وجہ ہے کہ اس دور کے واقعات کی تاریخ ہیں منضبط نہیں ہیں۔ البتہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اہلِ عرب فطری طور پر نہایت جنگ جو اور دلیر واقع ہوئے تھے اور ان میں مسلسل جنگیں جاری رہتی تھیں ——— یہ لوگ ان قبیلوی جنگوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھاتے تھے، اور پھر اپنے جنگی کارناموں، شجاعت و بسالت، قومی تفاخر اور اعمالِ حرب کا اظہار اشعار کے ذریعہ کرتے تھے،
اس بنا پر اس قوم کے ذخیرۂ شعر و ادب کو تاریخی سرمایہ تصور کیا جاسکتا ہے،

اس میں شک نہیں کہ اس قوم میں بے شمار فطری صلاحیتیں موجود تھیں اور یہی وجہ ہے کہ خدائے قدوس نے عالمِ انسانی کی اصلاح اور اس کی قیادت و امامت کے لیے اسی قوم کو چنا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام سے پہلے اس قوم کے پاس کوئی اخلاقی ضابطہ نہ تھا جو ان کی فطری صلاحیتوں اور اعلیٰ صفات میں رفعت و اعتدال اور نظم و انضباط پیدا کرتا۔ اس بنا پر اس قوم کی تمام اعلیٰ صلاحیتیں اصلاحِ انسانیت کے بجائے تخریبِ انسانیت پر صرف ہوتی تھیں، جیسے غذا کا اصل مقصد جسم کا تحفظ ہوتا ہے، مگر اس کا غلط طریقِ استعمال جسم کی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جود و سخا، شجاعت و تہور، خودداری اور شرافتِ نفس وہ صفات ہیں۔ جو اہلِ عرب کے خمیر میں داخل تھیں، مگر ان کی یہ صفات امن و اصلاح کے

بجائے شہر و قصبات کے خیمہ و خرگاہ میں رہتے تھے، چنانچہ ان کی خانہ بدوشی کا ابتدائی سلسل
رہتی تھی۔ ان لڑائیوں میں جس طرح کے وحشیانہ اخلاق سوز و فغان
کا اظہار کیا جاتا تھا، اس کے تصور ہی سے دنیا کانپ اٹھتی ہے

غرض اہل عرب کے ادبی لٹریچر کا بڑا حصہ ان کے جنگی کارناموں پر
مشتمل ہے۔ ان کے عقائد، خیالات، معلومات سب اس سے معلوم ہو سکتے ہیں، اور ان سے ایک
ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے، کہ ان کی لڑائی کے محرکات قومی حمیت، نسلی
عصبیت، جذبۂ انتقام اور شوق غنیمت تھے، چنانچہ ایک شاعر اپنا مقصد
جملہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

انی لمن معشر افنی اوائلھم — قیل الکماۃ الا این المحامونا

میں اس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جس کے بہادروں کی اس پکار
نے کہ ہائے ہمارے حامی کہاں ہیں، سب کو بچانے کے راستے پر ڈال کر اپنے آپ کو ہلاکت
میں ڈال دیتے ہیں۔

ان کے جذبۂ انتقام کا یہ حال تھا، کہ ایک شاعر اپنے قبیلہ کی تعریف
کرتے ہوئے لکھتا ہے

وما مات منا سید حتف انفہ — ولا طل منا حیث کان قتیل

ہم میں سے کوئی سردار کبھی اپنی موت نہیں مرا — اور ہمارے کسی مقتول کا خون رائیگاں نہیں گیا

اور ان کے شوق غنیمت کا یہ حال تھا، کہ ضرورت پڑنے پر اپنے بھائیوں پر
بھی چڑھائی کر دیتے تھے، چنانچہ ایک شاعر لکھتا ہے۔

واحیانا علی بکر اخینا — اذا ما لم نجد الا اخانا

اور بہت دفعہ ہم اپنے بھائیوں (یعنی بکر) پر حملہ کر دیتے ہیں، جب کہ اپنے
بھائی کے سوا ہم کسی دوسرے کو نہیں پاتے،

جنگ کے موقعہ پر یہ لوگ جس طرح کے شرمناک افعال کا ارتکاب کرتے
تھے اس کی ایک مثال ذیل کے شعر میں ملاحظہ ہو:

بقرنا الحبالی من شنوءة بعد ما — خبطنا بخیل الریف نجدا وخثعما

ہم نے جوش میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چیر ڈالے، جب کہ ہم خیف ریف
میں نجد اور خثعم پر غلبہ پا چکے تھے

اور ایک دوسرا شاعر اپنا مقصد جنگ ان الفاظ میں واضح کرتا ہے :-

فالهم بیضات الخدور — هنالك لا النعم المراخ

میدان جنگ میں ہمارا مقصد پردہ دار سفید فام عورتیں ہوتی ہیں، نہ کہ
چراگاہ سے واپس آنے والے اونٹ،

یہ ہے عرب جاہلیت کے مقاصد جنگ کا اجمالی خاکہ، مگر اسلام
کے بعد ان کے طبائع میں جو حیرت انگیز انقلاب پیدا ہوا، وہ اسلامی
تاریخ سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ان کے زمانہ کا اسلام کا ذخیرۂ ادب بھی
ان کے مقاصد جنگ کو آشکارا کرتا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن رواحہ
کے دو شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، یہ شعر انھوں نے اس وقت
کہے تھے، جب کہ وہ آنحضرت کی رکاب تھامے فاتحانہ انداز میں مکہ داخل
ہو رہے تھے،

خلوا بنی الکفار عن سبیله — خلوا فکل الخیر فی رسوله

اے کفار کی اولاد راستہ چھوڑ دو ۔۔۔ ہٹ جاؤ سب ساری بھلائی اللہ کے رسول میں ہے

قد انزل الرحمن فی تنزیله ۔۔۔ بان خیر القتل فی سبیله

خدا نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے ۔۔۔ کہ بہترین جنگ وہ ہے جو اللہ کی راہ میں ہو

اُمم سابقہ اور اقوام حاضرہ کا نقطۂ اتصال

فسادِ انسانیت کا حقیقی داعیہ

عہد قدیم اور عہد جدید میں ظواہر کے اعتبار سے کتنا ہی تفاوت کیوں نہ ہو، مگر اس امر کا انکار حقیقت کا انکار ہوگا، کہ تاریخ انسانی کے ہر دور میں مابعد الطبیعی تصوّرات اور ہمہ گیر اصول اخلاق کے خلاف انسان کو آمادۂ بغاوت کرنے والے محرکات قریب قریب یکساں رہے ہیں، یعنی تخریبی عواطف و جذبات کی اصل روح ہر زمانہ میں ایک ہی رہی ہے، اگرچہ اس کی تعبیر و اظہار کے طریقے زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں، اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہوگا، کہ شر و فساد کے ناپاک منصوبوں کی اصل روح آج بھی وہی ہے، جو آج سے کئی ہزار سال قبل تھی، اگرچہ ہر زمانہ میں وہ کسی نئے رنگ اور نئے لباس میں ظاہر ہوتی رہی ہے،

یہ داعیۂ فساد کیا ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے، کہ انسانی جماعت جس وقت شرف انسانی کے بلند تر مقاصد اور انسانیت مطلقہ سے تعلق رکھنے والے اصول اخلاق کو چھوڑ کر شخصی، گروہی اور طبقاتی اغراض و مصالح میں منہمک ہو جاتی ہے، تو اس کے معاشی اور معاشرتی زاویہ ہائے فکر کلیتہ

بدل جاتے ہیں، اور آگے چل کر ان کا پورا معاشرہ اور زندگی کا نقطۂ نظر ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اب یہ نیا معاشرہ جو محض لادینی اور مادی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، اس کی اصل فطرت ہی صدہا مفاسد انسانی کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ مثلاً زر پرستی، معاشی برتری کا جذبہ، وطنی، نسلی اور قبیلوی عصبیت اور اس قسم کے تمام انسانیت کش اور اخلاق سوز رجحانات اسی لادینی داعیہ فساد کی پیداوار ہیں۔ اگرچہ آج جمہوریت و مساوات کے علمبردار ان کو اصل مرض سمجھ کر ان کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مستقل مرض نہیں ہے، بلکہ علامات مرض ہیں، اصل مرض جیسے کہ عرض کیا گیا ہے الحاد مادیت کا عملی رجحان ہے، اور ہمہ گیر اصول انسانیت سے اغماض اور اغراض جزئیہ میں انہماک ہے۔

قرآن حکیم نے ان اغراض جزئیہ کو بہت سی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے، کہیں تو اس کے لیے شہوات و اھواء کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اور کہیں عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى کا اس پر اطلاق کیا گیا ہے اور دوسرے مقام پر اسی مفہوم کو تزیین شیطانی سے تعبیر کیا ہے،

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ	ہم نے پہلی قوموں کی طرف رسول بھیجے (انہوں
قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ	نے رسولوں کی دعوت کو نہ مانا) پس ہم نے
وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۔	تنگدستی اور مرض سے ان کو پکڑا تاکہ وہ عاجزی
فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا	اختیار کریں۔ پس ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جب
تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ	ان پر ہمارا عذاب نازل ہوا تو وہ جھک جاتے

وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُکِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ کُلِّ شَیْءٍ حَتّٰی اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝

مگر ان کے دل سخت ہو گئے تھے اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظروں میں خوبصورت بنا دیا تھا، پس جب وہ نصیحت خداوندی کو بھول گئے تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ہماری دی ہوئی نعمتوں پر اترانے لگے تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا، پس وہ نا امید ہو کر رہ گئے،

(انعام)

حقیقت یہ ہے، کہ انسانی تباہی کے جتنے مناظر آج تک دیکھے گئے ہیں، ہوائے ضلالت یا تزیین شیطانی کے مظاہر ہیں، کہ جس چیز پر سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی، اس کو نظر انداز کیا جاتا رہا، اور جو چیز اصل مقصد حیات کے اعتبار سے محض ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتی ہے، اس کو مقصود بالذات بنایا جاتا رہا ہے، اور صرف اسی وجہ سے ان کی زندگی فساد و اختلال سے دوچار ہوتی رہی ہے

مرشد رومی حکیم پاک زاد — سر مرگ انتہاں بر ما کشاد
ہر ہلاک امت پیشیں کہ بود — زانکہ بر صندل گمان بردند عود

(پیام مشرق)

ظاہر ہے کہ جب اس غیر فطری اساس فکر پر کسی معاشرہ انسانی کی تعمیر ہو گی، تو وہ اصل فطرت اور طبیعت کے اعتبار سے صدہا مفاسد کو اپنے اندر لیے ہوئے ہوگا، یعنی وحشت و بہیمیت، ظلم و تعدی، غصب حقوق انسانی

شان، نامساوات، خود غرضی اور اس طرح کی تمام باتیں اس کے اندر موجود ہیں
اب اس فاسد معاشرہ کی وجہ سے نسلِ انسانی ہمہ گیر شورش و تباہی سے
دوچار ہوتی ہے، تو اس کا الزام کسی خارجی قوت پر ہرگز نہیں تھوپا جا سکتا
بلکہ یہ اس جدید معاشرہ کی فطرت کا اقتضا ہے، اور ایسی قوم کو بربادی
و ہلاکت سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ	کیا ہم آپ کو ان لوگوں کی بابت بتائیں جو اعمال کے
أَعْمَالًا۔ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ	لحاظ سے خسارہ میں ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی جد
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ	و جہد صرف حیات دنیوی میں گم ہو گئی ہے اور
أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (کہف)	وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں۔

گذشتہ سطور میں یہ ظاہر کر دیا گیا ہے، کہ تمام سابقہ اور اقوام حاضرہ کے بنیادی
نقطہ ہائے نظر میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس بنا پر اقوام معاصرہ کی قومی جد
و جہد یا جنگ و جدال کا ذہنی پس منظر معلوم کرنا بالکل آسان ہو جاتا ہے، یعنی شدید
قومی اور نسلی تعصب، غلبہ و تسلط کا جنون اور معاشی برتری کی خواہش یہ مادی محرکات
ہیں جو اقوام حاضرہ کو جنگ پر آمادہ کرتے ہیں، وہ کوئی اصولی یا انسانی مقصد ان
کی نظر کے سامنے نہیں ہے۔

آج ہر قوم کا محورِ عمل اس کی خود ساختہ قومیت (نیشنلزم) ہے اور اس قومیت
کا تحفظ ہی اس کا آخری نصب العین ہے، یہی وجہ ہے، کہ ان کی جنگوں میں انسانیت
و شرافت اور اخلاق کی جس طرح مٹی پلید کی جاتی ہے، اس کی مثال کسی بدترین
دورِ وحشت میں بھی نہیں ملتی۔ آج دنیا کی ہر قوم نیشن، انسانیت کے تمام

حقوق کی تنہا اجارہ دار بننا چاہتی ہے، اور دوسرے لوگ اس کی نظر میں اس قابل نہیں ہیں، کہ ان کو بھی انسانوں کی طرح شریفانہ زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے چنانچہ قومیت کا یہ زہریلا جذبہ قوم کے ایک ایک فرد میں پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اب ایسی حالت میں ان اقوام سے یہ توقع رکھنا ہی فضول ہے، کہ وہ جنگ و قتال کے موقع پر انسانیت کے ہمہ گیر اصولوں کی رعایت کریں گی، اگر ان اقوام کی قومیتوں کی بنیادیں ہمہ گیر اصول انسانیت اور اخلاقی اقدار (مارل ویلیوز) پر استوار ہوتیں جو نسل انسانی کے لیے ایک مشترکہ وراثت کی حیثیت رکھتے ہیں تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا یعنی آج دنیا کے ہر انسان کے دل میں انسانیت و شرافت کے لئے کچھ نہ کچھ جگہ ہوتی، اور اس کی ہر کوشش تخریب و فساد کے بجائے تعمیر و اصلاح کے لیے صرف ہوتی، اور آج انسانوں کی شرمناک درندگی اور بہیمیت سے اخوت انسانی کا ہمہ گیر رشتہ تار تار نہ ہوتا، بلکہ بدبخت انسان ان تعصب آلود اور محدود قومیتوں سے نکل کر ایک وسیع تر اور ہمہ گیر انسانی برادری کے ذریعہ قیام امن و مساوات کا علمبردار ہوتا۔

اس بات سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، کہ اسلامی دعوت کا تعلق انسانیت مطلقہ سے ہے، اور اس کا منشا یہ ہے، کہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر رشتہ مودت و مواخات میں منسلک کر دیا جائے، اور اس کا موضوع بحث وہ ہمہ گیر اصول اخلاق ہیں جو کسی خاص فرقہ (کمیونٹی)، یا قوم (نیشن) سے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ دنیا کا ہر انسان نفس انسانیت کی بنا پر ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے

اسلامی جہاد کا نظریہ اور اصولی پس منظر

اب ہم اسلامی جہاد کی حقیقت اور اس کے مقاصد و غایات پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ ابتدائے انسانیت سے دنیا میں زندگی کے دو متخالف نظریے چلے آ رہے ہیں ایک خالص مادی نظریہ اور دوسرا اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی نظریہ۔ ان دو نظریوں کے علمبردار ابتدا کار ہی سے باہم متصادم رہے ہیں۔ یہی دو مختلف مکاتب خیال ہیں جو روز اوّل سے اپنے نصب العین کی کامیابی کے لیے مصروف کشمکش ہیں۔ ایک کا مشن ہے ارباباً من دون اللّٰہ کی خدائی کو برقرار رکھنا، اور بندگان خدا کو اس کی پرستش و اطاعت پر مجبور کرنا۔ اس مشن کے سب سے بڑے نمائندے ملوک و سلاطین اور مترفین (سرمایہ دار) ہیں۔ دوسرے مکتب خیال کا مشن ہے انسانی حاکمیت والوہیت کو ختم کرنا، اور ان الحکم الا للّٰہ کی ابدی حقیقت کو بروئے کار لانے کے لیے زندگی کے آخری لمحے تک جد و جہد جاری رکھنا۔ اس مشن کے علمبردار خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء و رسل ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان دو گروہوں کا اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہیں کہ ان کے نقطہ ہائے نظر میں معمولی رد و بدل یا اصلاح و ترمیم کے بعد اتحاد ہو سکے بلکہ ان میں شدید نظری و اصولی اختلاف ہے۔ اور جب تک ان میں سے کوئی ایک اپنا موقف چھوڑ نہ دے اس وقت تک وہ دوسرے کے ساتھ

کسی شکل میں نباہ نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے، کہ قرآن کریم نے ان دو گروہوں کو متناقض ناموں سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ کسی جگہ حزب اللہ، اور حزب الشیطان کے الفاظ سے ان گروہوں کے تضاد مطلق کو بیان کیا گیا ہے، کہیں اصنوا اور کفروا سے ان کے نظری اختلاف کو ظاہر کیا ہے، کہیں متقین اور فجار کی جامع اصطلاحوں سے ان کے عمل و کردار اور اخلاق و سیرت کے تفاوت کو واضح کیا ہے، اور کہیں خیر البریہ اور شر البریہ سے ان کے ایمان اور کفر کے نتائج کو واشگاف کر دیا گیا ہے،

نیز جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے، ان دونوں گروہوں کا باہم تصادم کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے، اور نہ ہی تاریخ کے کسی ایک دور سے مخصوص ہے بلکہ بدء الخلق سے شر و فساد کی طاغوتی طاقتیں سادہ لوح انسانوں کو فریب اور خطرناک عیاریوں سے گمراہ کرتی رہی ہیں، اور ان کے مقابلہ میں ارباب دعوت و اصلاح نے ہمیشہ اپنا کام جاری رکھا ہے، اور آئندہ بھی جاری رہے گا، چنانچہ شیطانی گروہ کا کام ہے، انسانیت کی تخریب اور بغی و فساد یعنی انسانوں کو ہمہ گیر اصول انسانیت، الہیاتی تصورات اور مصالح عامہ سے ہٹا کر گروہی اور جزوی مفادات کی طرف مائل کرنا، اور اس کے بالکل برعکس خدائی گروہ کا کام عام انسانوں کی تخریب و فساد کی راہ سے ہٹا کر فکر و عمل کی راہ مستقیم اور انسانیت کی غایت علمی قصوی کی طرف لے جانا ہے، اور چونکہ ان دونوں گروہوں کے مقاصد میں بنیادی طور پر تضاد پایا جاتا ہے، اس بنا پر ان میں باہم تصادم بھی ناگزیر ہے، اس سے ظاہر ہے، کہ یہ دعوت حقہ جو اس

خدائی گروہ یعنی انبیاء و رسل اور ان کے تابعین کی طرف سے بلند ہوتی رہی ہے
ایک ازلی دعوت ہے، اور عام اصطلاح میں اسی کا نام اسلام ہے، یعنی
تاریخ کے ہر دور میں جس قدر ہادی اور مصلح پیدا ہوئے، انھوں نے عام
انسانوں کو اسلام ہی کی دعوت دی، اور ان کا مقصد فقط یہ تھا، کہ انسانوں
کو افراط و تفریط اور ظلم و فساد کی راہوں سے ہٹا کر راہ عدل کی جانب ان کی
راہنمائی کریں،

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	ہم نے اپنے رسولوں کو معجزات کے ساتھ بھیجا
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ	اور انکے ہمراہ کتاب اور میزان بھی نازل کی،
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید)	تاکہ لوگ نقطہ عدل پر کھڑے ہو جائیں،

اسلام در حقیقت دین فطرت کا دوسرا نام ہے، اور اس کا اولین اقتضا یہ ہے
کہ انسانی جماعت میں جس قدر غیر فطری عوامل کار فرما ہیں ان کی ایک خاص الہامی
اسلوب دعوت کے ذریعہ اصلاح کی جائے، یعنی ان کے فکر و ذہن اور عمل
و کردار میں ایک مقدس انقلاب پیدا کیا جائے جس سے ان کی پوری زندگی
پاکیزہ، بے ضرر اور پر امن زندگی بن جائے، نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم، نہ اعلیٰ ہو
نہ ادنیٰ، نہ اشرف ہو نہ ارذل، نہ مظلوم ہو نہ ظالم اور نہ بندہ ہو نہ آقا، غرض
انسانی شرف کے جتنے خود ساختہ معیار ہیں، ان کو یکسر ختم کر دیا جائے
اور تمام انسانوں کو ایک ہی ہمہ گیر رشتہ اخوت انسانی میں منسلک کر دیا جائے
حاکمیت ہو تو صرف احکم الحاکمین کی اور قانون ہو، تو اسی کا! اور تمام انسان
آپس میں بھائی بھائی ہوں اور خدا کے وفادار بندے!

كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا (بخاری)

تم اللہ کے عبادت گزار بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ

یہ ہے اسلام کی دعوت! اور اس معصوم و مقدس دعوت کی راہ میں جو جد وجہد کی جاتی ہے، خواہ وہ زبان و قلم سے ہو، یا جنگ و قتال سے اس کا نام اسلامی اصطلاح میں "جہاد" ہے، اس بنا پر یہ دعویٰ یقیناً حق بجانب ہوگا کہ جس طرح دینِ فطرت ایک ازلی نظامِ حیات ہے، اسی طرح اس کو بروئے کار لانے کے لیئے جو سعی و کوشش عمل میں لائی جاتی رہی ہے، وہ بھی ایک قدیم حقیقت ہے، اگرچہ یہ صحیح ہے، کہ لفظ جہاد ایک قرآنی اصطلاح ہے، اور اس کی ابتدا نزولِ قرآن ہی سے مانی جاسکتی ہے، مگر جہاں تک اس کی معنویت اور حقیقت کا تعلق ہے، وہ انسانیت کی توام ہے، یعنی انسانی تاریخ کی ابتدا اس کی ابتدا ہے، اور اس کا سلسلہ آئندہ بھی تا قیامت جاری رہے گا،

لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق (ابو داؤد)

میری اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کے لیے لڑتا رہے گا۔

سطور بالا سے ظاہر ہے، کہ یہ جہد مقدس اور سعی مسلسل کسی جزوی مقصد کے لیے نہیں ہے، اور اس کا ذہنی پس منظر کسی ایک نسل یا جغرافی قوم (نیشن) کی سربلندی نہیں ہے، بلکہ نفسِ انسانیت کی فلاح و نجات ہے یعنی اسلام انسانی دنیا کو ایک ایسے سبے ضرر اور صالح نظامِ تمدن سے روشناس کرنا ہے جس کی بنیاد مصالح کلیہ، مابعد الطبیعی تصورات اور ہمہ گیر اخوت بشری

پر ہے، اور ان اخلاقی اور انسانی تصورات کو انسانی سوسائٹی کے ہر شعبہ میں
اساسی درجہ حاصل ہے، اس بنا پر اسلامی معاشرہ اپنی طبیعت اور فطرت
کے اعتبار سے کائنات انسانی میں رشتۂ اخوت پیدا کرتا ہے اور جس
نظریہ زندگی پر اس معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے، وہ ایک ہمہ گیر صداقت (یونیورسل
ٹروتھ) اور نوعِ انسانی کا مشترکہ نصب العین ہے جو کسی ایک نسلی فرقہ
یا گروہ سے کسی طرح کا اختصاص نہیں رکھتا، اس بنا پر اسلامی معاشرہ میں
کسی طرح کے گروہی اور طبقاتی تصادم (سیکشنل وار) کا امکان نہیں ہے
بلکہ اس معاشرہ میں تمام بین الاقوامی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں، اور جہاد
دراصل اسی معاشرہ کے قیام کے لیے تعمیری جدوجہد ہے، مگر چونکہ یہ تعمیر
تخریب کے سوا کسی طرح ممکن نہیں ہے، اس لیے اسلام نے حکم دیا ہے،
کہ پہلے فاسد معاشرہ انسانی اور غیر الٰہی نظامِ تمدن کو ختم کیا جائے اور اس
کے بعد ایک صالح معاشرہ اور جدید نظامِ تمدن کی بنیاد ڈالی جائے۔ لہٰذا
جہاد اسلامی پر اگر غیر متعصب نظر سے غور کیا جائے تو یہ تعمیرِ انسانیت کا
ایک عظیم الشان عمل ہے جس کے بغیر کائنات انسانی امن و مساوات،
حق و صداقت، ایمان و عمل اور انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم رہ
جاتی ہے اور شر و فساد کی پھیلائی ہوئی تاریکیوں کو پھلنے پھولنے اور ابھرنے سے
کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال)

وقارِ انسانیت اور جہاد

نیز مسلم اہل قلم نے اسلامی جہاد کو کچھ ایسے
خوشنما انداز میں پیش کیا ہے، کہ ہر وہ شخص

جو جہاد کی اصل حقیقت سے واقف نہ ہو، ان کی تحریروں کو پڑھ کر لرزہ براندام ہو جاتا ہے، اور وہ لازمی طور پر اسلام کو ایک وحشیانہ مذہب اور اہل اسلام کو ایک ظالم اور وحشی قوم تصور کرنے لگتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے، کہ ان لوگوں نے نہ کبھی اسلام کے فلسفہ اجتماع کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور نہ ہی ان کی قومی اور سیاسی مصلحتوں نے ان کو کبھی اس کی اجازت دی ہے بلکہ آج تک ان کی یہ طے شدہ حکمت عملی رہی ہے، کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے جو کچھ ممکن ہو کر گزرنا چاہیئے خواہ اس میں حق وصداقت اور دیانت و شرافت کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے، چنانچہ ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف ابھارنے میں انہوں نے ہمیشہ اسی ذلیل ہتھیار کو استعمال کیا ہے اور آج بھی ان کے اس طرز عمل میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ آج تو ان کے ہندوستانی شاگردان رشید کو بھی ان کی نگاہ ناز نے اس حد تک پہنچا دیا ہے، کہ وہ اپنے قومی مسائل میں ہر طرح کی دیانت اور اخلاقی قدروں سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور گذشتہ ایک سال میں انہوں نے جس طرح انسانیت و اخلاق کی مٹی پلید کی ہے، اس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، آنے والی نسلیں ان کے اس بھیانک کردار پر ماتم کریں گی،

غرض اہل مغرب کے قلم سے مسئلہ جہاد پر آج تک جو کچھ نکلا ہے وہ اسی ذلیل ڈپلومیسی کا نہایت شرمناک مظاہرہ ہے یعنی جب انہوں نے ضروری خیال کیا، کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اقوام دنیا کی حمایت حاصل کی جائے اور پھر دوسری اقوام کی امداد و اعانت سے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو ختم کر دیا

جائے، تو انھوں نے اسلامی تعلیمات کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ شروع کیا اور اسلامی احکام و اعمال کو ایسی خوفناک اور سراپا غلط شکل میں پیش کیا، کہ دیانت و صداقت سر پیٹ کر رہ گئی، اور اس ضمن میں مسئلہ جہاد پر انھوں نے خاص طور پر زور دیا، کیونکہ یہی وہ مسئلہ ہے، جس سے دنیا کے انسانوں کو یہ باور کرایا جا سکتا تھا کہ مسلمان ایک سخت جنگجو، وحشی اور ظالم قوم ہے، اور ان کے مذہب کی سب سے بڑی کتاب ہی ان کو اس وحشت و بہیمیت کا سبق دیتی ہے۔ اس لیے دنیا کی بھلائی اسی میں ہے، کہ اس قوم کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے، چنانچہ اس مقصد میں انکو بہت حد تک کامیابی ہوئی، اور دنیا کی سب سے بڑی بڑی قوموں نے مل کر نہ صرف وحدت اسلامی کو پارہ پارہ کیا، بلکہ اکثر ممالک اسلامی کو محکوم بنا لیا، مگر یہ عجیب بات ہے، کہ مسلمانوں کو وحشی اور ظالم کہنے والوں نے وحشت و بربریت اور قتل و سفاکی کی ایسی مثال قائم کر دی، کہ اسلامی تاریخ تو کیا پوری انسانی تاریخ میں اس کا جواب نہیں ملتا

الغرض جہاد اسلام کی حقیقت نہ سمجھنے یا عمداً اس کو غلط انداز میں پیش کرنے کا یہ قدرتی نتیجہ تھا، کہ جہاد کے متعلق غیر اقوام تو کیا خود بہت سے مسلمان بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، اور انھوں نے دفاعی رنگ میں جہاد کو جس شکل میں پیش کیا وہ جہاد کی نہایت گمراہ کن تعبیر تھی، ہم آگے چل کر بتائیں گے، کہ جہاد کے داعیات اور مقاصد کیا ہیں، مگر سطور بالا سے اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ جہاد اسلامی اس مقدس سرفروشانہ جدوجہد کا نام ہے، جو دنیا سے ظلم و تشدد

اور انسانوں کے خود ساختہ معیارِ شرف کو مٹانے اور مظلوم انسانوں کی کثیر آبادی
کو جسے انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے حقوقِ انسانیت
سے بہرہ ور کرنے، نیز انسانی حاکمیت کو ختم کر کے امن عالم انسانی زیر ہمہ گیر
امن و مساوات قائم کرنے کے لیے فرض کیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اربابِ
سیادت و حکومت اور اہلِ دولت و ثروت کے لیے جہاد یقیناً
پیامِ ہلاکت ہے، مگر دنیا کے پس ماندہ اور غریب طبقوں کے لیے جہاد ایک
وہ عملِ عظیم ہے جو بلند و پست کے امتیاز کو مٹا کر انسانوں میں مساوات
عامہ پیدا کرتا ہے، جو دنیا کی عظیم ترین آبادی کے لیے مجاہد کی صدائے تکبیر سے
بڑھ کر کوئی آواز خوش آئند نہیں ہے۔

از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر یادگارے کہ دریں گنبد دوار بماند

جہاد دراصل ایک نہایت مقدس اور متمدن انسانی عمل ہے جو دنیا
فساد کو جڑ سے اکھاڑنے اور انسانیت عامہ کی فلاح و نجات کے لیے معرض
وجود میں آتا ہے، اور اس کے سوا اس کا کوئی مقصد نہیں کہ خدا کی زمین میں خدا کا
قانون مانا جائے اور ایسی اصولوں کے تحت دنیا کے تمام انسان باہم بھائی بھائی
بن کر رہیں اور دنیا کی وہ کثیر آبادی جو انسانی حاکمیت کے تحت حریتِ فکر اور
مساوات عامہ کی برکات سے محروم ہے۔ وہ اسے خدائی نظامِ حیات کے تحت
وہ سب کچھ حاصل ہو جو کسی بڑے سے بڑے حکمران یا امیر زادہ کو حاصل ہو سکتا ہے
عربی ہو یا عجمی، یورپ کا شہری ہو یا صحرائے افریقہ کا صحرائی، خدائی نظام میں اسے
انسانیت کے وہ تمام حقوق حاصل ہوں، جن کا وہ انسان کی حیثیت سے

مستحق ہے، اور اس پر کسی گورے کی حکمرانی تسلیم کی جاسکے نہ کالے کی، بلکہ کوئی انسان دوسروں پر حکومت کرنے کا مجاز نہ ہو، اور دنیا کے تمام انسان ایک ہی اعلیٰ و برتر ہستی کے محکوم ہوں اور مساویہ پلو پر خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھا سکیں، یہ ہے حقیقتِ جہاد، اور یہ ہے اس کا اصولی پس منظر! اب غور کیجئے کہ انسانوں کا وہ مقدس گروہ جو اس عظیم ترین مقصد کو لے کر اپنے عیش و آرام کو خیرباد کہتے ہوئے اس وادی پرخار میں قدم رکھتا ہے، کہ دنیا کی کثیر آبادی کو انسانی حاکمیت کے پنجۂ استبداد سے نکال کر احکم الحاکمین کے اقتدار اعلیٰ کے تحت لا کھڑا کرے اور دنیا کے تمام انسانوں پر فوز و سعادت کی راہیں کھول دے کیا انسانی آبادی کا یہ فرض نہیں ہے، کہ اس مقدس گروہ انسانی کے لیے اپنے دیدۂ و دل کو فرشِ راہ بنا لے؛ جو قدم دنیا کے مظلوم اور بیکس انسانوں کو حریت و آزادی دلانے کے لیے بڑھتا ہے، کیوں نہ اس کے آگے پھولوں کی سیج بچھا دی جائے؛ اور جو تلوار ان بدقسمت انسانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اٹھتی ہے جو ابد الآباد سے انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیے گئے ہیں کیوں نہ ایسی تلوار کو متبسم ہونٹوں سے چوم لیا جائے، بلکہ ہر انسان کا اخلاقی اور انسانی فرض ہے، کہ ایسی سرفروش اور محسن انسانیت جماعت کو سر آنکھوں پر جگہ دے اور اس کے زندگی بخش پیغام کے ذریعہ مسرت جاودانی حاصل کرے ؎

مژدۂ عیش جاوداں خواہی بیا ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

حقیقت میں جہاد کی تعریف میں صرف وہی عمل داخل ہوگا جس کا مقصد استیصال فتنہ اور اعلائے کلمۃ الحق ہو، یعنی خدا کی زمین میں صرف اسی کی حاکمیت اعلیٰ مانی

جائے ، اور خدائی نظام کے ماتحت ہر انسان پر فوز و فلاح کی راہیں وا ہو جائیں لہٰذا اس مقصد عظیم کے لیے جنگ کی جائے تو یہ جنگ شر نہیں بلکہ سراپا خیر ہے جیسے ایک ڈاکٹر ناسور کا اپریشن کرتا ہے ، اور اس کے اس عمل کو کسی طرح قابل ملامت قرار نہیں دیا جاتا ، کیونکہ وہ مریض کی جان بچانے کے لیے ایسا کرتا ہے ، اور اس کا یہ عمل اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے ، بالکل اسی طرح جہاد اسلامی انسانیت عامہ کو ضلالت و غوایت کی تمام کاریوں سے بچانے کے لیے عمل میں آتا ہے ، اور یہ مقدس عمل ہر لحاظ سے نہ صرف مستحسن بلکہ عالم انسانی کے لیے ناگزیر ہے ، ہاں اگر اس کی تہ میں کوئی اور مقصد کار فرما ہو ، تو وہ حقیقت میں جہاد ہی نہیں ہے ، بلکہ سراپا شر ہے ؎

گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند جنگ باشد قوم را نا ارجمند

(اقبال)

لفظ جہاد کا غلط استعمال گذشتہ نصف صدی میں کانگریس کی سیاسی مشنری نے جہاد کے مقدس لفظ پر جو ظلم کیا ہے ، اس سے کون شخص واقف نہیں ہے ، چنانچہ اس جماعت کے تمام مسلم اور غیر مسلم مراکز اشاعت نے اس لفظ کو نہایت بری طرح رسوا کیا ، اور ہر اس شخص کو مجاہد کا خطاب دیا گیا ، جو وطن اور قوم کے لیے ایک آدھ دفعہ جیل چلا گیا ، اور یہ کبھی نہیں سوچا گیا ، کہ مجاہد کا مقدس لفظ کس طرح کی معصوم سیرت ، بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کی ترجمانی کرتا ہے ، اور جن لوگوں پر اس کا اطلاق کیا جا رہا ہے ، وہ مجاہد کے ضروری خصائل کے حامل ہیں یا

ہمیشہ کے لیے باہم متصادم رہیں گے، کیونکہ ان میں کوئی امر وجہ اشتراک نہیں ہوگا، مگر اسلام کے نزدیک کوئی مادی تصور بنا قومیت نہیں ہے بلکہ چند اصول و نظریات ہیں جن کی بنا پر وہ ایک بین الملی قومیت (INTER NATIONALISM.) کی تعمیر کرتا ہے، اور اس صورت میں صرف دو قومیتوں کا وجود باقی رہ جاتا ہے، ایک اسلام کی بین الاقوامی قومیت ہے جس میں دنیا کا ہر انسان بلا امتیاز رنگ و نسل شامل ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسلام کے بنیادی اصول و نظریات کو تسلیم کر لے۔ اور دوسری ملت وہ ہے جس کی اساس کافرانہ نظریہ حیات پر ہے، اور یہ ملت خواہ کتنے گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، مگر اسلام کی نظر میں یہ سینکڑوں گروہ مل کر ایک ہی ملت ہیں اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ اب ظاہر ہے، کہ اسلام کا جہاد ملی اس قومی جنگ سے بالکل الگ ہے، جو متضاد جغرافی قومیتوں میں لڑی جاتی ہے، بلکہ یہ ایک نظریاتی اور اصولی جنگ ہے، جو دینی نظریوں کی خاطر لادینی نظریوں سے لڑی جاتی ہے ؎

تیغ بہر عزت دین است و بس مقصد او حفظ آئین است و بس

چنانچہ قرآن حکیم میں جہاد کے جو اعلیٰ مقاصد بیان کیے ہیں، ان میں کوئی ایک مقصد بھی ایسا نہیں ہے، جو انسانیت کی غایت تصوری کے بجائے محض کسی مادی خواہش سے متعلق ہو، بلکہ جہاد کے تمام مقاصد میں ایک ہی اخلاقی روح کارفرما نظر آتی ہے، جو ان سب میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، مثلاً قرآن حکیم نے جہاد کے لیے ایک اہم اور عظیم الشان مقصد یہ قرار

(اخرجہ احمد عن ابن عمرؓ) ذم سے شمار ہوگا،

کار نبوت اور عمل رسالت کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے، تو اس سے صاف واضح ہو جائے گا، کہ انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد کا پہلا مرحلہ تطہیر فکر ہے، اور پھر تعمیر فکر، یعنی تعمیر یا اصلاح کی ابتدائی جدوجہد اسباب فساد کے ازالہ سے شروع ہوتی ہے، اور تاوقتیکہ فساد کی نوعیت اور اس کے موجبات کا صحیح عرفان حاصل نہ ہو، کوئی اصلاحی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی، اگرچہ یہ کوشش ظاہر بین نگاہوں کے لیے کتنی ہی جاذب نظر اور پرکشش کیوں نہ ہو، مگر افسوس ہے، کہ زمانۂ حال کی ہر دینی تحریک کی ابتدا حقائق سے بالکل تہی دامن اور مفروضات کے گنجلوں میں الجھی ہوئی ہوتی ہے، یعنی اجتماعی اور ملی تحریک کو جس نقطۂ آغاز سے شروع کرنا چاہیے، اس کی طرف کسی کو خیال تک نہیں ہوتا، مگر محض بے حقیقت دعاوی اور بے معنی ہنگاموں سے تحریک بپا کر دیا جاتا ہے، یعنی فکر و عمل کی کج ادائیاں جوں کی توں باقی رہتی ہیں، اور زور بیان کی سحر کاریوں سے اذہان و قلوب میں ہیجان پیدا کر دیا جاتا ہے،

دوسرا داعیہ: تخریب و فساد کی ناپاک کوشش | اصلاح انسانیت کی مقدس کوشش

جسے قرآنی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر کیا گیا ہے، مسلمان کی زندگی کا اولین فریضہ ہے، اور اسی فریضہ کی صحیح بجا آوری کی بنا پر مسلمان کو امامت و قیادت کا عظیم الشان منصب عطا ہوا ہے،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ

تم سب سے بہتر امت ہو جسے لوگوں کی امامت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، کہ تم نیکی کا حکم دو اور

وَمَنْ يُشَاقِّ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ	اور جو شخص خدا کی مخالفت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا۔
(الحشر پ ۲۸ ق)	

چوتھا واجب القتل — نقض عہد | یعنی اہل کفر کی کوئی جماعت مسلمانوں سے معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کا ارتکاب کرے

چونکہ یہ فعل ایک بدترین اخلاقی جرم ہے، اور اسلام کسی ایسے جرم کی ایک لمحہ کے لیے بھی اجازت نہیں دیتا اس بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ایسی قوم یا جماعت کو تلوار کے زور سے اطاعت پر مجبور کریں، تاکہ وہ آئندہ ایسی حرکت شنیعہ کے ارتکاب کی جرأت نہ کر سکیں،

الَّذِينَ عَاهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ (التوبہ)	جن کافروں سے آپ معاہدہ کر چکے ہیں اور وہ ہر دفعہ معاہدہ کو توڑ دیتے ہیں اور وہ اس جرم عظیم سے بچتے نہیں ہیں، پس اگر آپ ان کو جنگ میں پائیں تو ان کو ایسی عبرتناک سزا دیں، کہ ان کے ذریعہ آئندہ والی نسلوں کو منتشر کر دیں، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں
فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ (التوبہ)	تم کفر کے رہنماؤں سے لڑو کہ ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں، تاکہ وہ ایسی حرکتوں سے باز آ جائیں،

جہادِ اسلامی اور عہدِ حاضر کی سیاسی اور معاشی جنگیں!

چونکہ آزاد اسلامی مملکت کو قیامِ جہاد کا اولین فریضہ ہے، اس لیے جو لوگ محض سطحی نظر سے اشیاء کا مطالعہ کرنے کے عادی ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ آخر جہادِ اسلامی اور دوسری اقوامِ عالم کی سیاسی اور معاشی جنگوں میں فرق کیا ہے؟ کیونکہ دوسری قومیں بھی سیاسی تسلط، اقتدار اور معاشی مفادات کے لیے کمزور اقوام پر حملہ آور ہوتی ہیں اور ان کی عزت و آزادی کو سلب کر کے ان کی قسمت کی مالک بن جاتی ہیں، نیز ان کی جدوجہد کا اولین مقصد بھی یہی کچھ ہے، کہ وہ مفتوحہ ممالک میں اپنے مخصوص طرز کی حکومت قائم کر سکیں، اور وہاں کے باشندوں کو اپنے وضع کردہ آئینِ سیاست کی بندشوں میں جکڑ دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے اسلامی تصورِ زندگی اور نظریۂ سیاست کا گہری نظر سے مطالعہ نہیں کیا، وہ اسلامی جہاد کو اقوامِ دنیا کی جنگ ہائے زرگری کی فہرست میں شامل کرنے میں ایک حد تک مجبور ہیں، کیونکہ ان کی نگاہ کوتاہ بین کی حدِ پرواز یہیں تک ہے اور اسلام کا حقیقی فلسفۂ زندگی نامنود

قہقری پر مجبور کرتی ہے، اور بندہ اپنے آپ کو اسی جگہ پاتا ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا، اب وہ پھر اپنے ہی زمانہ ساز اسلوب فکر کی مدد سے کوئی دوسری راہ تلاش کرتا ہے، اور اس پر پہلے سے زیادہ عزم و ارادہ کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتا ہے، مگر ہوتا کیا ہے؟

ع دست اندر بند تا افتاد در بند دگر

اور یہ افتادو بند دگر کا سلسلہ جاری رہتا ہے تاوقتیکہ وہ اپنی عقل خود بین کو عقل جہاں بیں کے حوالے نہیں کرتا، یا فرد و وجود اور ہست و بود کی مکانی اور زمانی حد بندیوں کو توڑ کر اپنے تصور زندگی میں بنیادی تبدیلی پیدا نہیں کرتا، یعنی زندگی کے اس ابدی تصور کے تحت اپنے فکر و ذہن کی اصلاح و تعمیر کی جانب متوجہ نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ اگر عقل و شعور میں اس رنگ کی تبدیلی رونما ہو جائے، تو حیاتِ انسانی کی کٹھن اور دشوار گذار منزلیں چند لمحوں میں طے ہو سکتی ہیں ۔

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج، انقلاب اندر شعور (اقبال)

آج جس پر امن اور خوشحال زندگی کا تصور، تمام عالم کے جولان فکر کا مرکز بنا ہوا ہے، اور ہر ذی شعور کو اس کی طلب و جستجو ہے، اور بڑے بڑے ارباب دانش و فکر کی مسلسل جد و جہد کے باوجود آج تک اس کا سراغ نہیں مل سکا، وہ کچھ اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اسے مشکل بنا دیا گیا ہے، مگر کوئی چاہے کہ مقصود کو اس کے وجود کی تکمیل کے بغیر ہی حاصل کر لے، تو یہ اسی کی

مطابقت ہے، ہاں اگر منشاء قدرت کے مطابق مقدمات و مبادی کے مراحل
خوش اسلوبی سے طے کر لیے جائیں، تو گوہر مراد کے عطا کرنے میں قدرت ہرگز
بخل نہیں کرتی (الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (الآیۃ)

انسان کی مادی زندگی کے بقا کے لیے غذا کو جو اہمیت حاصل ہے،
اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن اجناس خوردنی کی کاشت سے ان کے جزو
بدن بننے تک کئی ایک منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں، اور ہر منزل تک پہنچنے کے
لیے ایک معین ضابطہ کے تحت کام ہوتا چلا جاتا ہے، کسان کی جو ذمہ داریاں
ہیں وہ مقررہ دستور کے مطابق انجام دیتا ہے، اور کئی مراحل طے کرنے کے
بعد غلہ تیار کر کے منڈی میں لاتا ہے، مگر اب تک وہ کھانے کے قابل نہیں ہوتا
تاوقتیکہ اس کے پسوانے اور پکانے کے تمام لوازمات مہیا نہ ہوں، اور
اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب اسے کھانے کے قابل بنا لیا جاتا ہے، تو
اس کے کھانے کے بعد بھی یہ جزو بدن نہیں بن سکتا، جب تک کہ کھانے
والے کے اعضاء ہضم اپنے وظائف طبعی کی تکمیل نہ کریں، چنانچہ اتنے طویل
سفر میں اگر کسی ایک منزل پر بھی فطری اور طبعی اصولوں سے انحراف کیا جائیگا
تو اس کے قدرتی نتائج سے بہر حال دوچار ہونا پڑے گا، مثلاً کسان کسی غیر
صالح زمین میں فصل کاشت کرتا ہے، یا زمین تو قابل زراعت ہے مگر فصل
پکنے کے لیے جن لوازمات کی ضرورت پڑتی ہے، وہ اس کو میسر نہیں ہیں یا
فصل پکنے کے بعد جس قدر محنت و مشقت اٹھانی پڑتی ہے، اس سے وہ قاصر
ہے، تو ان صورتوں میں یا تو غلہ پیدا ہی نہ ہو سکے گا یا مطلوبہ مقدار سے

نہ ہو تو سفرِ زندگی کا رخ کیسے متعین کیا جا سکتا ہے، اور جب سفر کا رخ ہی متعین نہیں، تو دنیا کی وہ کون سی طاقت ہے، جو آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیگی، کیا یہ عقل و شعور کا تقاضا نہیں ہے، کہ قدم اٹھانے سے قبل یہ سوچ لیا جائے کہ پہنچنا کہاں ہے، اور نقطۂ مقصود کیا ہے! اگر آپ یوں ہی، اندھا دھند سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں، تو کیا یہ ممکن نہیں، کہ آپ کا قدم سمت مخالف کی جانب بڑھتا چلا جائے اور آپ اس خیال میں سرمست رہیں، کہ ہم اب منزلِ مقصود تک پہنچنے ہی والے ہیں، حالانکہ ایک ایک قدم آپ کو منزلِ مقصود سے دور لے جا رہا ہو!

انسان ابتدا ہی سے اس غلطی میں مبتلا رہا ہے، کہ وہ اپنے فہم و شعور کے بل بوتے پر مشکلاتِ زندگی پر قابو پا سکتا ہے، اور وہ اپنی عقل کو ہمیشہ خطا کاری سے بالاتر تصور کرتا رہا ہے۔ چنانچہ ہمیشہ خود ہی اس نے اپنے لیے نصب حیات متعین کیا، اور پھر اس تک پہنچنے کے لیے نئی نئی راہیں تلاش کیں، سینکڑوں سکیمیں بنائیں، لاکھوں منصوبے گھڑے، اور ہر نئی سکیم پر مارے خوشی کے جھومنے لگا، کہ اب تک منزل تک پہنچنے میں دیر نہ لگے گی، مگر چند قدم آگے بڑھتے ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور وہ زبانِ حال سے پکار اٹھا۔ ؎

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

قرآن حکیم نے ان لوگوں کی نسبت ارشاد فرمایا ہے:۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ	کیا ہم آپ کو ان نامراد و خسارہ گروں کا حال
أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي	بتائیں، یہ وہ لوگ ہیں، کہ جن کی ساری دوڑ دھوپ
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ	صرف دنیوی زندگی میں گم ہو گئی ہے، اور وہ

باہم نبرد آزما ہیں، اور ملت پاکستان خصوصیت سے اس نظریاتی جنگ کی
آماجگاہ بنی ہوئی ہے، مگر کچھ لوگ اشتراکیت کے نام سے اس قدر خائف
ہیں، کہ وہ اس کی نسبت سرمایہ داری کے جبر و تشدد کو اھون البلیتین
تصور کرتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے، کہ اشتراکیت نے اپنی لادینی حیثیت
کو بالکل عریاں کر دیا ہے، مگر سرمایہ داری سے یہ ممکن نہیں ہے، کہ وہ مذہب
کا لبادہ اتار کر اپنے ذہنی نقوش کو اجاگر کر دے، کیونکہ اس کی زندگی کا سہارا
ہی دین و مذہب کی نمائش ہے، چنانچہ سرمایہ دار دنیا کی ہمیشہ سے یہ
فطرت رہی ہے، کہ جب بھی اس کے کاسۂ سر پر کوئی نئی ضرب لگتی ہے تو وہ
چیخ اٹھتی ہے، اور جھٹ کوئی نیا لباس بدل کر سامنے آجاتی ہے۔ اور بالعموم
دین و مذہب کا جامہ تو ضرور زیب تن کر کے اور شریعت کی [illegible]
قوتوں کو شکست دینے کی سعی کرتی ہے، اور حقیقت میں دین و مذہب سے
اس کو اتنی نسبت بھی نہیں ہوتی جتنی کہ اس کے مخالف کو ہوتی ہے، مگر وہ یہ جانتی
ہے، کہ دین و شریعت کے آہنی لباس کے سوا اس کے بچنے کی کوئی صورت
نہیں ہے، اس لیے یہ نہایت معصومانہ انداز میں دنیا کو باور کرانا چاہتی ہے کہ
دوسرے لوگ مذہب و دین کو مٹانا اور زندقہ و الحاد کو ابھارنا چاہتے ہیں اور
عام لوگ اس کے معصومانہ طرز تکلم اور منافقانہ لباس تزویر سے دھوکا کھا
جاتے ہیں، اور وہ نہیں سمجھتے، کہ ان ملحد اور بے دین لوگوں سے زیادہ دشمن
حضرت سرمایہ دار مذہب و دین کا دشمن ہے، مگر اس کا طریق [illegible]

ہے

کے مسئلہ کو مدارِ زندگی قرار دے دیا ہے حالانکہ یہ مسئلہ حیاتِ انسانی کا محض ثانوی مسئلہ ہے،

غرض نظامِ سرمایہ داری (کیپٹلزم) ہو یا نظامِ اشتراکیت (سوشلزم) اصولی اور اقداری حیثیت سے دونوں لعنت ہیں، اور انسانیت کے بدترین دشمن ہیں۔

زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج

سطورِ بالا سے ظاہر ہے، کہ اسلام کا تصورِ زندگی مغربی مفکرین کے مادی تصورات سے بالکل الگ ہے، اور وہ صرف انسان کی دنیوی اور مادی زندگی تک ہی محدود نہیں، بلکہ ایک دوسری ابدی زندگی پر بھی حاوی ہے، یعنی اسلام اس زندگی کے لیے حیاۃ طیبۃ (پاکیزہ اور پرامن زندگی) کا وعدہ کرتا ہے، اور اخروی زندگی کے لیے وہ عیشۃ راضیۃ (پسندیدہ اور مرغوب زندگی) کا مژدہ سناتا ہے،

اسلام کا تصورِ سیاست

اسلام کا نظریۂ حکومت و سیاست بھی اس اخلاقی اور مابعد الطبیعیاتی نظریۂ حیات کے تابع ہے، یعنی اسلام میں اقتدارِ حکومت محض سیاسی تسلط اور معاشی تفوق کے لیے نہیں ہے، بلکہ چند عمیق اصولِ زندگی کے احیاء اور اقامتِ دین کے لیے ہے، ملتِ اسلامیہ کی ہیئتِ حاکمہ اس امر کی مکلف ہے، کہ وہ اپنے تمام حکومتی کاروبار کو ان زریں قوانین کا

پابند بنا دیتے، جو احکم الحاکمین نے اس کے لیے مقرر کی ہیں، اور اس خدائی ضابطۂ سیاست سے سر مو بھی انحراف نہ کرے۔ گویا اسلامی مملکت میں ہیئت حاکمہ کا ہر رکن اس بات کا یقین رکھتا ہے، کہ وہ اپنے اعمال حکومت میں مطلق العنان نہیں ہے، بلکہ اسے ایک ایک عمل کے لیے جواب دہ ہونا ہے۔ فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ (الآیۃ)

چنانچہ اسی تصور حاکمیت الٰہیہ کی اساس پر اسلامی معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے، اس لیے اس میں کسی طرح کے ظلم و تعدی، غصب حقوق، قتل و غارت اور انسان کشی کے لیے قطعاً گنجائش نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر انسان انسانوں کے بنیادی حقوق (FOUNDAMENTAL RIGHTS.) سے بہرہ ور ہوتا ہے کیونکہ جو حکومت مقتدر رب العالمین کے منشا کے مطابق اس کی زمین میں حکومت کا کاروبار چلاتی ہے، وہ کسی طرح اس کے بندوں کے لیے زحمت نہیں ہو سکتی، بلکہ سراسر رحمت ہوتی ہے، دینی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا کسی طرح مذموم نہیں ہے بلکہ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے، چنانچہ قرآن حکیم نے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ	ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جاتی ہے جہاد
ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ	کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا
لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن	گیا ہے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے، یہ جنگجو
دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن	جہاد کی اجازت دی گئی ہے، وہ لوگ ہیں جن

يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ

(سورہ حج)

کو ناحق گھروں سے نکال دیا گیا ہے صرف اتنا کہنے پر کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی ایک جماعت کے ذریعہ تمام دوسرے بدکردار گروہ کی ریشہ دوانیوں کی مدافعت نہ کرے تو تمام خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں بکثرت اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے منہدم کر دی جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کے دین کی مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ لوگ جن کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے، وہ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں غلبہ عطا کریں گے تو نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام امور کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

نص قرآنی سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام و استحکام کے لیے ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو منصب حکومت کو ذاتی منفعت کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ خوف خدا کے ساتھ صحیح رہنمائی کا حق ادا کریں یعنی برائی کو مٹانے اور نیکی کو ابھارنے کے لیے حکومت و مملکت کے تمام ذرائع کو تحریک دیں اور اس جدوجہد کو اس وقت تک جاری رکھیں کہ برائی کی تمام طاقتیں مٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ کی تائید و برکت کے مستحق ہو

سے ہمکنار ہو جائے۔ چنانچہ مذکورہ آیات میں غور کرنے سے حقیقت خود ہی
واضح ہو جاتی ہے کہ خدائے قدوس نے مسلمانوں کو اس شرط پہ جہاد کی اجازت
دی ہے، کہ وہ کامل آزاد اور خود مختار ہو سکے بغیر و شر کے اخلاقی
تصورات کے تحت حکومت کا نظم و نسق چلائیں، اور ان کی اجتماعی اور ملی
طاقت نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے صرف ہو یعنی امت حنفی اقوام
و ملل کی طرح جو صرف اپنی محدود قومیتوں کے سیاسی غلبہ اور شخصی تفوق
کے لیے برسرپیکار رہتی ہیں محض اپنے اجتماعی یا قومی اقتدار کے لیے نبرد
وجہد نہیں کرتی، بلکہ اس کی نظر انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات پر ہوتی ہے
کہ اس کو آخری حیثیت رہتا ہیں کہ اعلیٰ منصب امامت و قیادت سے
مخصوص کیا گیا ہے۔ ؎

گفت آں گلیم خویش بدر می برد ز موج
وین سعی می کند کہ برآرد غریق را

نیز ان آیات میں اذن جہاد کا حقیقی واجب بھی وضاحت سے بیان کر دیا گیا
ہے، کہ اگر انسانوں کی یہ مقدس اور سرفروش جماعت جہاد کے ذریعے
ظالم اور شریر عناصر کی سرکوبی نہ کرتی، تو انسانیت کی سب سے زیادہ
قیمتی اور مقدس متاع بھی ان شریر النفس انسانوں کی دست برد سے
محفوظ نہ رہ سکتی، یعنی انسانوں کے معابد اور مقامات مقدسہ بھی منہدم
کر دیے جاتے، مگر خدائے قدوس چاہتا ہے کہ صالح افراد انسانی کے
ذریعہ بگڑے ہوئے ظالم انسانوں کو ختم کر دیا جائے اور اس مقصد کے لیے

ربّ العالمین نے اُمّتِ حنفی کو منتخب کیا ہے

ان تصریحات کے بعد یہ سمجھ لینا آسان ہوگا کہ جہادِ اسلامی اقوامِ حاضرہ کی خود غرضانہ قومی جنگوں کی طرح بہیمانہ لڑائی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مقدس بااصول جنگ ہے، جو نوعِ انسانی کو اس کے اعلیٰ نصب العین سے ہمکنار کرنے اور انسانیت کی متاعِ گراں کے تحفظ اور عالمِ انسانی میں ہمہ گیر امن و مساوات قائم کرنے کے لیے لڑی جاتی ہے، نیز عہدِ حاضر میں حریت و آزادی کے نام پر جو جنگیں لڑی جاتی ہیں چونکہ ان کی تہ میں بھی مادی استفادہ کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اور وہ بھی انسانیتِ عامہ کے لیے نہیں، بلکہ محض ایک جغرافی قوم یا کسی خاص انسانی فرقہ سے مخصوص ہوتا ہے، اس لیے اس نوعیت کی جنگیں بھی جہادِ اسلامی سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں، کیونکہ جہاد کی تہ میں ایک ہمہ گیر اور اعلیٰ جذبۂ آزادی و حریت کارفرما ہے

قتلِ خود بیں دگر و قتلِ جہاں بیں دگر است

بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است (اقبالؒ)

یہ لوگ اس دعویٰ کی تائید میں قرآن کریم کی چند ایسی آیات پیش کرتے ہیں جن
میں علی الاطلاق اہل کفر کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ان آیات میں کسی
زمان و مکان اور قوم و نسل کی تخصیص نہیں ہے۔ اور اسی سلسلہ میں وہ آیات
بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں جنگ و قتال کی غایت و انتہاء یہ قرار دی گئی ہے
کہ اہل کفر اقتدار اسلامی کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔

در اصل مذکرہ خیال کا اصل منشاء یہی آیات جہاد ہیں، اور یہی وجہ
ہے کہ خود مسلمانوں کا ایک گروہ یہی عقیدہ رکھتا ہے کہ اسلام کی سیاست
خارجہ یعنی مسلمانوں کا غیر مسلموں سے تعلق [illegible] ان
چیزوں میں سے کسی ایک پر مبنی ہے، قبول دعوت یا اطاعت یا [illegible] سب سے
پہلے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی جاتی ہے، اگر وہ اس دعوت کو قبول
کر لیں، تو وہ مسلمانوں کے بھائی متصور ہوتے ہیں، اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر
ان کو دولت اسلامیہ کی اطاعت پر مجبور کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا افکار کی دو شقیں ہیں، پہلی شق [illegible] یہ ہے کہ مسلمان غیر مسلموں سے صرف اختلاف
عقیدہ و مسلک کی بنا پر [illegible] غیر مسلموں سے جنگ [illegible]
اور دوسری شق یہ ہے کہ اسلام صرف اس صورت میں غیر مسلموں کو زندہ
رہنے کا حق دیتا ہے کہ وہ اپنی جان و مال اور عزت و ناموس مسلمانوں کے
حوالے کر دیں [illegible] کی زندگی بسر کریں، چونکہ
یہ دونوں شقیں [illegible] اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں، اس لیے مناسب ہی ہے
کہ ہر ایک پر [illegible] مستقل [illegible] بحث کی جائے۔

اصل مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ دعوت
دستاویز میں جہاد و قتال کا اصل و تعین کیا ہے۔ یعنی اسلام جس طرح کا ہمہ گیر
سیاسی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے حصول کے لیے اس نے کیا
طریقہ متعین کیا ہے۔ کیا جنگ قتال ہی کے ذریعہ وہ اس مقصد کی تکمیل کرنا
چاہتا ہے یا اس کے حصول کی اصل راہ عمل کچھ اور ہے، اور جہاد و قتال اس
راہ کے عوارض و موانع کو ہٹانے کے لیے ایک ناگزیر عمل ہے

حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس طرح کا ہمہ گیر سیاسی انقلاب پیدا
کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اس نے بالکل فطری اسلوب کار متعین کیا ہے
یعنی وہ اس کار عظیم کو قتل و غارت، تشدد و سفاکی اور دہشت انگیزی سے انجام
دینا نہیں چاہتا بلکہ دعوت و ارشاد اور تطہیر نفوس کے ذریعہ وہ اذہان و قلوب
میں ایسی فکری تبدیلی پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے دنیا کے انسان خود بخود ہی
اس نئے انقلاب کی جدوجہد میں حصہ دار بن جائیں۔ اسلام اس غرض کے
لیے کسی پر دباؤ ڈالنا نہیں چاہتا کہ وہ اس کے اصول و نظریات اور فلسفہ
زندگی اور انقلاب کو تسلیم کرے۔ کیونکہ اسلام قانون فطرت ہے۔ اور
وہ ہر معاملہ میں فطرت کے تقاضے کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک
انسان کو اس بات کا یقین نہ ہو کہ میں جس عقیدہ و مسلک کو قبول کر رہا ہوں
میری زندگی کی فلاح و نجات اسی سے وابستہ ہے۔ اس کا یہ ایمان اس
کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خارجی دباؤ
کے زیر اثر اس عقیدہ کو قبول کر لے۔ مگر یہ چیز زیادہ دیرپا و محکم یا ناگزیر ہو

ہو جائے گا، وہ اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ آئے گا۔ لیکن اگر دلائل و براہین
سے اس کے قلب کو مطمئن کر دیا جائے، اور وہ خود محسوس کرنے لگے، کہ جس عقیدہ
کو میں نے قبول کیا ہے، وہ فی الواقع نجات انسانی کے لیے ناگزیر ہے۔ یعنی
اس کو اس عقیدہ کے متعلق کما حقہ شرح صدر اور اطمینان قلب حاصل
ہو جائے، تو وہ نہ صرف اپنے لیے اس جدید مسلک کو مفید خیال کرے گا، بلکہ
وہ اپنا فرض اولین تصور کرے گا، کہ دوسروں کو بھی اس جدید نظریہ زندگی سے
روشناس کرائے۔ چنانچہ اسی حکمت کے پیش نظر اسلام نے اس معاملہ
میں جبر و اکراہ سے منع کر دیا ہے۔ اور کسی عقیدہ کے رد و قبول کے سلسلہ
میں انسان کو پورا اختیار دے دیا گیا ہے، کہ وہ اپنے صواب دید سے اپنے
لیے جو راستہ چاہے اختیار کرے،

لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ) — دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہے۔ ہدایت کی راہ گمراہی کی راہ سے بالکل واضح اور الگ ہو چکی ہے۔

فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (الآیۃ) — جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کفر کی راہ اختیار کرے۔

مگر جہاں تک حقیقت امر کے اظہار و بیان کا تعلق ہے خالق کائنات نے ارسال رسل
اور نزول کتب کے ذریعہ اس کی تکمیل کر دی ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے
اس نے ہر زمانہ میں نبی بھیجے، کہ وہ انسانوں کو صحیح راہ نجات سے آشنا کر دیں
تاکہ وہ ابدی سعادت حاصل کر سکیں، [illegible] ہادی سے خالی [illegible] نہ تھا

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر) — تمام انبیاء کے بھیجنے کے بعد [illegible] قوموں کی

دولت پر قبضہ کرنے کے لیے انسانی آبادیوں کو تہ و بالا کریں یا انسانوں کو محض
اس لیے اسلامی اقتدارِ اعلیٰ کے قبول کرنے پر مجبور کریں، کہ ان کا عقیدہ و مسلک
دوسرا ہے، غرض اسلام کا اصلی طریقِ دعوت یہ ہے، کہ پر امن اور بے ضرر
طریق سے دینِ حق کی اشاعت کی جائے، اور خدا کے ازلی پیغام کو دنیا کے
ہر حصّہ میں پہنچایا جائے، یہاں تک معمورۂ ارضی کا کوئی بعید سے بعید گوشہ بھی ایسا
نہ رہے، جہاں یہ پیغام نہ پہنچایا گیا ہوگا، چنانچہ قرآن حکیم نے اسی طریقِ دعوت کو
حکمت اور موعظہ حسنہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ
بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ (الآیۃ)

ان نصوصِ قرآنی سے صاف ظاہر ہے، کہ اسلام اپنے پیرؤوں کو اس بات
کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، کہ وہ خدا کی مخلوق کو محض اس لیے نشانہ ستم بنائیں کہ
وہ الگ عقیدہ و مسلک رکھتے ہیں، البتہ اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ حق ضرور
دیتا ہے، کہ وہ جہاں کہیں انسانوں کی آبادی ہے، وہاں پہنچ کر حق کی آواز بلند
کریں، اور حفاظتِ خود اختیاری کی خاطر جہاں تک ممکن ہو اپنے لیے
طاقت فراہم کریں، تاکہ اگر کوئی جماعت ان سے محض اس بنا پر مزاحم ہو، کہ وہ خدا کا
پیغام کیوں سناتے ہیں، اور وہ بے وجہ مسلمانوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا
کرے، تو مسلمان اس قسم کے شر پسند عناصر کی شر انگیزیوں کو قوتِ بازو سے ختم
کر سکیں، یہاں تک کہ تمام روئے زمین میں کوئی ایسی طاقت باقی نہ رہے، جو اس
اہم ترین زندگی کی انجام دہی میں ان کی مزاحمت کر سکتی ہو، چنانچہ جہاد بالسیف
کا اصلی مقصد و موقف یہی ہے اور ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے

ضروری ہو جاتا ہے، کہ وہ اپنی تمام طاقتوں کو ان لوگوں کے خلاف متحرک کر دیں، جو مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض سے باز رکھنا چاہتے ہیں، اور علی الاعلان یا خفیہ طور پر اسلام کی دعوت حق کی مخالفت کرتے ہیں،

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَسَیُنْفِقُوْنَھَا ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْھِمْ حَسْرَۃً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ (الانفال)

بے شک جو لوگ کافر ہیں وہ اپنے اموال اس غرض کے لیے خرچ کرتے ہیں، کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں، پس وہ اپنے اموال خرچ کرتے رہیں گے، پھر یہ اموال انہیں کے لیے حسرت و افسوس کا باعث بنیں گے، پھر وہ مغلوب ہوں گے

کتاب اللہ اور اعمال رسالت سے یہ بات بالکل واضح ہے، کہ اسلام مذہب کے نام پر بے گناہ انسانوں کا خون بہانے اور انسانی آبادیوں کو تہہ و بالا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، چنانچہ زمانہ رسالت کے کئی واقعات اس سلسلہ میں پیش کیے جا سکتے ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ خود آنحضرتؐ کا طریق دعوت و تبلیغ کیا تھا، اور کیا وہ اہل کفر کو محض کفر کی وجہ سے واجب القتل تصور فرماتے تھے، اور ان سے جہاد بالسیف کو ضروری قرار دیتے تھے یا جہاد بالسیف کے لیے کچھ دوسرے اسباب تھے۔ حقیقت یہ ہے، کہ زمانہ رسالت کے تمام واقعات صلح و جنگ کا جو اسلام کے بین الملی قانون (INTERNATIONAL LAWS.) اور قانون جنگ کے لیے ماخذ ہیں، اگر بغور جائزہ لیا جائے تو ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ زمانہ

رسالت بلکہ خلافت علی منہاج النبوت کے دورِ سعادت میں بھی کسی قوم پر محض اس لیے حملہ نہیں کیا گیا، کہ وہ کسی دوسرے عقیدہ کی پیرو ہے۔ اس دور میں جس قدر جنگیں ہوئی ہیں، ان کا اصلی محرک اس وقت کی اقوام کا وہ جارحانہ طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف اختیار کیا تھا، مگر جن اقوام یا قبائل نے ایسا نہیں کیا، ان پر مسلمانوں نے ہرگز فوج کشی نہیں کی بلکہ ان کو چند شرائط کے ساتھ اپنے حال پر چھوڑ دیا، چنانچہ کتب حدیث و سیر میں "سرایا" کے عنوان سے ان تبلیغی جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات کی جانب بھیجی تھیں، یہ جماعتیں اگرچہ باقاعدہ مسلح ہوتی تھیں، کیونکہ اپنی حفاظت اس کے سوا ممکن نہ تھی، مگر ان کو ہدایت کردی جاتی تھی، کہ وہ لوگوں سے نرمی سے پیش آئیں، اور اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کے ذریعہ ان کو اپنے قریب لانے کی کوشش کریں، چنانچہ طبری نے لکھا ہے

قد کان رسول اللہ صلعم یبعث فیما حول مکۃ السرایا تدعوا الی اللہ ولم یامرھم بقتال	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اردگرد تبلیغی جماعتیں بھیجی تھیں، اور ان کو لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا

بخاری میں ایک واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے، کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کی سرکردگی میں، ایک تبلیغی جماعت بنی حذیفہ کی طرف بھیجی انھوں نے وہاں پہنچ کر اس قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی، مگر ان لوگوں نے انکار کیا اس پر حضرت خالد نے کچھ لوگوں کو قتل کیا، اور دوسروں کو اسیر بنا کر

اپنے سپاہیوں کی تحویل میں دے دیا، اور پھر سب کو حکم دیا، کہ تم اپنے اپنے اسیر کو قتل کردو، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بھی اس جماعت میں موجود تھے، انھوں نے کہا، کہ ہم ایسی حرکت ہرگز نہ کریں گے، جب یہ جماعت مدینہ واپس پہنچی اور یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا، تو آپ نے حضرت خالد کے اس فعل کو سخت ناپسند فرمایا، اس موقع پر یہ الفاظ آپ نے ارشاد فرمائے،

اللّٰھم انی ابرء الیک مما صنع خالد (بخاری کتاب المغازی) — اے خدا! میں خالد کے اس فعل سے بیزار ہوتا ہوں،

قبیلہ اشجع کے کچھ لوگ مدینہ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ سے لڑنا نہیں چاہتے، بلکہ یہ چاہتے ہیں، کہ معاہدۂ صلح ہو جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست کو قبول فرمالیا، یہ لوگ اس وقت تک کافر تھے، مگر جب معاہدۂ صلح ہو چکا، تو بعد میں خود ہی انھوں نے اسلام قبول کرلیا،

(جزء طبقات ابن سعد صفحہ ۴۴)

یہ صحیح ہے، کہ بعض آیات قتال سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے، کہ اہل کفر صرف عقیدۂ کفر کی بنا پر واجب القتل ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ خود مسلمانوں کا ایک گروہ یہی عقیدہ رکھتا ہے، ہم آگے چل کر آیات قتال کی وضاحت کریں گے مگر اس مقام پر اتنا بتا دینا ضروری ہے، کہ اسلام اگرچہ دعوت اسلامی کے سلسلہ میں کسی طرح کے جبر و اکراہ کی اجازت نہیں دیتا، اور نہایت پرامن طریق سے اس فریضہ کو انجام دینے کی تاکید کرتا ہے مگر وہ اس بات سے بھی غافل نہیں ہے

کہ قوتِ غالبہ اور اقتدارِ حکومت کے سوا یہ ممکن ہی نہیں کہ تمام روئے زمین میں اس کام کو جاری رکھا جائے جو اسلام کا اصل منشا ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے اسلام چاہتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک آزاد اور خود مختار مرکز ہو جہاں وہ اپنی منتشر طاقتوں کو اکٹھا کر سکیں، اور اسلام کے منشا کے مطابق مسلمانوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت کا کام پوری آزادی کے ساتھ جاری رکھ سکیں، اور ضرورت پڑنے پر اپنی تمام طاقتوں کو ان قوتوں کے خلاف متحرک کر سکیں جو مسلمانوں کو ان کے فرائضِ منصبی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہوں، اور اعلانیہ یا خفیہ طور پر مرکزِ اسلامی کو کمزور کرنا چاہتے ہوں، اور چونکہ یہ مرکز صرف تنظیم اور گروہ بندی کے لیے معرضِ وجود میں آتا ہے اس لیے جو شخص اس مرکز کو توڑنا اور اس کے خلاف سازش کرنا چاہتا ہے تو وہ اسلام کی نظروں میں سخت ترین مجرم اور واجب القتل ہے

من جاءکم وامرکم جمیع یرید	جو شخص اس غرض سے آئے کہ تمہارے
ان یفرق بینکم فاقتلوہ کائنا	شیرازۂ ملت کو منتشر کر دے، تو اس کو
من کان (رواہ مسلم)	قتل کر دو، خواہ وہ کوئی ہو

اور قرآن حکیم میں ایسی کوشش کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے جو دعوتِ اسلامی یا مرکزِ اسلامی کے خلاف عمل میں لائی جاتی ہو

اِنَّمَا جَزَآؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ
وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ	کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں
فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا	ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے

أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (الآیۃ)	یا سولی پر چڑھایا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا انکو جلاوطن کردیا جائے یہ انکے لیے دنیوی کی سزا ہے، اور آخرت میں انکے لیے بہت بڑا عذاب ہے،

اسلام کی سیاستِ خارجیہ

یہاں تک صرف اتنا عرض کیا گیا ہے، کہ جہاد بالسیف دعوتِ اسلامی کا ضروری جزو یا لازم غیر منفک نہیں ہے، لیکن عملاً اکثر و بیشتر حالات میں اس کے بغیر دعوت کا جاری رہنا مشکل ہوجاتا ہے، اور ایسے حالات کے لیے جہاد بالسیف کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اب ہم اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں،

گذشتہ مباحث سے یہ واضح ہوچکا ہے، کہ اسلام محض عقیدہ و مسلک کی بنا پر کسی کو واجب القتل قرار نہیں دیتا، اور یہ کہ اسلام کا اصل منشا جنگ و قتال نہیں ہے، بلکہ قیامِ امن ہے، اس بنا پر یہ کہنا یقیناً صحیح ہوگا، کہ اسلام کی سیاستِ خارجیہ کی اساس قیامِ امن اور عالمِ انسانی کی حقیقی نجات کا مقدس جذبہ اخوت ہے، اور تاوقتیکہ حکومتِ اسلامی کو جنگ کے لیے مجبور نہ کردیا جائے، اس وقت تک اسلام اس کو جنگ و قتال کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے، کہ نصوصِ قرآنی کے علاوہ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ کے بہت سے واقعات اس کی تائید کرتے ہیں،

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اقوام عرب سے وقتاً فوقتاً جو عہد
کیے، ان سے مقصد یہی تھا، کہ جنگ کے بغیر ملک میں امن قائم رہ سکے،
اور خواہ مخواہ ملک کو شورش و بدامنی کے حوالے نہ کیا جائے، چنانچہ
مدینہ میں تشریف آوری کے بعد قبائل یہود سے باقاعدہ معاہدہ ہوا، جس میں
زیادہ اس بات پر زور دیا گیا تھا، کہ ہم دونوں فریق مل کر اپنے ملک کی حفاظت
کریں، اور بیرونی دشمن کے دفاع کے لیے متحد ہو جائیں، قبائل یہود نے
ایک دو مرتبہ بدعہدی بھی کی، مگر ان کو معاف کر دیا گیا، مگر اس قدر فراخ دلانہ
سلوک کے باوجود جب یہود مدینہ اپنی خفیہ سازشوں سے باز نہ آئے
تو اس کے بعد ان کو عبرت ناک سزا دی گئی، اور ظاہر ہے، کہ دنیا کی کوئی
حکومت اس بات کو برداشت نہیں کرتی، کہ اس کی قلمرو میں حکومت کے
خلاف اس قسم کی سازشیں کی جائیں، اور خفیہ طور پر دوسرے ممالک سے
ساز باز کی جائے، چنانچہ اس قسم کے مجرمین کے لیے ہر حکومت سخت گیرانہ
قوانین وضع کرتی ہے جن سے ایسے عناصر کا قلع قمع ہو سکے، چنانچہ مسلسل
بدعہدیوں کے بعد یہود کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا، جس کے وہ مستحق تھے،

اَلَّذِیْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ
یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ
وَّهُمْ لَا یَتَّقُوْنَ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ
فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ
لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ وَاِمَّا تَخَافَنَّ

جن سے آپ نے معاہدہ کیا، پھر وہ ہر دفعہ
اپنے عہد کو توڑتے ہیں اور وہ (اس کے انجام
سے) ڈرتے نہیں ہیں، پس اگر آپ ان کو
لڑائی میں پالیں تو ان کو ایسی عبرت ناک
سزا دیں، کہ ان کے ذریعہ دوسروں کو بھی

مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ (الانفال)

منتشر کر دیں، اور اگر آپ کو کسی قوم سے بد عہدی کا خوف ہو تو ویسا ہی کے طریق پر عہد کو ان کی طرف پھینک دیں بے شک اللہ تعالیٰ بد عہدی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے

اسی طرح قریش سے ایک معاہدہ کیا گیا، جس میں یہ طے کیا گیا کہ دس سال تک ایک فریق دوسرے کے خلاف جنگی کارروائی نہ کرے گا ظاہر ہے اس زمانے میں قریش ہی مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن تھے جس وقت یہ معاہدہ ترتیب دیا گیا تھا اس سے کچھ ہی عرصہ قبل مسلمانوں سے ان کی شدید جنگیں ہو چکی تھیں، اور فریقین کے دلوں میں آتش انتقام بھڑک رہی تھی، مگر آنحضرت صلعم کا منشا یہ تھا، کہ جنگ و قتال کے بغیر ہی اگر ان لوگوں کے دلوں میں تبدیلی پیدا ہو جائے، تو جنگ کی نوبت ہی نہ آنے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بہت تھوڑے عرصہ میں عرب کے اطراف و جوانب میں اسلام پھیل گیا، بلکہ خود قریش کے بہت سے قدر اصحاب نے اسلام قبول کر لیا،

فلما كانت الهدنة ووضعت الحرب اوزارها وامن الناس كلم بعضهم بعضا فالتقوا وتفاوضوا في الحديث والمنازعة فلم يكلم احد بالاسلام يعقل شيئا الا دخل فيه (زہری [illegible])

جب صلح ہو گئی، تو لڑائی نے اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور لوگ ایک دوسرے سے محفوظ ہو گئے، پس وہ باہم ملنے لگے اور باہم گفت و مذاکرہ کرنے لگے پس جس سمجھدار آدمی سے اسلام کی بابت بات چیت ہوئی وہ اسلام میں آ گیا،

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ قریش کی قوت ٹوٹ گئی، اور ان میں مسلمانوں کے مقابلہ کی ہمت ہی نہ رہی، چنانچہ ۸ھ میں جب آنحضرت صلعم نے قریش پر فوج کشی کی، تو انھوں نے دفاع و مقابلہ کے بغیر ہی اطاعت قبول کر لی۔

اسلام اور احترام انسانیت

فتح مکہ کا واقعہ اسلامی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے، اور اسی واقعہ سے اسلامی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ بلاد عرب کے تمام قبائل اور ریاستوں نے حکومت اسلامی کی اطاعت قبول کر لی۔ اور حکومت اسلامی پہلے سے وسیع تر ہوگئی، مگر اس واقعہ میں اہل نظر کے نزدیک اس سے بھی زیادہ جس چیز کو اہمیت حاصل ہے، وہ احترام انسانیت کے اس مقدس جذبہ کا مظاہرہ ہے، جو صرف ملت اسلامی کے حصہ میں آیا ہے، دوسری تمام اقوام و ملل میں کلی طور پر ناپید ہے۔

قریش کی دیرینہ بغض و عداوت اور مسلسل ایذا رسانی ہرگز اس کی مستحق نہ تھی، کہ اسے آسانی کے ساتھ معاف کر دیا جاتا، اور دنیا کی کوئی قوم ایسے متعصب اور کینہ پرور دشمن کو زندہ رہنے کا حق نہیں دے سکتی، اور قریش کا کینہ اور تعصب اور جذبہ انتقام تو اس حد تک پہنچا ہوا تھا، کہ پوری انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، مکہ معظمہ کی تیرہ سالہ زندگی میں ان لوگوں نے ایک لمحہ کے لیے صاحب رسالت علیہ السلام اور عام مسلمانوں کو امن و چین سے بیٹھنے نہ دیا، اور ہجرت مدینہ کے بعد انھوں نے بارہا مسلمانوں پر حملہ کیا، اور اسلام کو مٹانے کی جو ممکن کوشش ہو سکتی تھی اس سے دریغ نہ کیا

غرض اسلام کے تیئس سالہ دور میں ان لوگوں نے مسلمانوں پر جو وحشیانہ مظالم کیے تھے، ان کی یاد اب تک مسلمانوں کے دلوں میں تازہ تھی، بلکہ کچھ مسلمان چاہتے تھے، کہ اس ظالم اور بدکردار قوم کا ایک فرد بھی زندہ نہ رہنے دیا جائے چنانچہ جس وقت اسلامی فوج مکہ میں داخل ہو رہی تھی، تو سعد بن عبادہ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے،

الیوم یوم الملحمۃ	الیوم تستحل الکعبۃ
آج کا دن سخت خونریزی کا دن ہے	آج کعبہ کی حرمت اٹھا دی جائے گی،

ان الفاظ سے ابوسفیان کو بہت دکھ ہوا، اور رحمۃ للعالمین صلعم سے اس کا ذکر کیا، تو آپ نے حضرت سعد کو ان الفاظ میں جواب دیا،

کذب سعد، ولکن ھذا الیوم	سعد نے یہ جھوٹ کہا ہے، بلکہ یہ بڑا دونا
یوم فاز و ھذا الیوم یعظم	کا دن ہے، اور آج کعبہ کی عظمت کو دوبالا
فیہ الکعبۃ	کیا جائے گا

چونکہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہوئے تھے، اور قریش نے لاشوں کی بھی تذلیل کی تھی، اور مسلمانوں کو ان کے اس ناروا سلوک پر اس قدر صدمہ ہوا تھا، کہ کچھ مسلمانوں نے عزم کر لیا تھا، کہ قریش پر غالب آنے کے بعد ہم ایک مسلمان کے بدلہ میں دو آدمی قتل کریں گے، اس پر قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی تھی

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا	اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو تم انکو اتنا ہی نقصان
عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ	پہنچاؤ جتنا انھوں نے تمکو نقصان پہنچایا ہے اور

لِلصّٰبِرِیْنَ (النحل) صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کیلئے بہت بہتر ہے

جب عسکر اسلامی کمک کے بائیں طرف سے شہر میں داخل ہو رہا تھا تو ایک شخص نے بآواز بلند یہ نعرہ لگایا:

لا قریش بعد الیوم آج کے بعد قریش زندہ نہ رہیں گے،

مگر سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا:۔

کفوا عن القوم الا اربعة (ترمذی) سوائے چار اشخاص کے قریش کے تمام افراد سے ہاتھ روک لو،

یہ وہ ظالم اور سفاک انسان تھے جن کی خون آشام تلواروں سے اب تک مسلمانوں کا خون ٹپک رہا تھا اور دنیا کے لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ آج قریش کا ایک بچہ بھی زندہ نہ بچ سکے گا اور خود قریش کی یہ حالت تھی کہ ان کی بداعمالیاں ان کی آنکھوں کے آگے قیامت کا نقشہ پیش کر رہی تھیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جن لوگوں سے ہم مسلسل تیرہ سال کے عرصہ میں انتہائی وحشیانہ سلوک کرتے رہے ہیں، وہ آج یقیناً ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔ مگر دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی جب کہ رحمۃ للعالمین صلعم نے ان ظالم اور سفاک انسانوں کو ان الفاظ سے مخاطب کیا:۔

اذھبوا فانتم الطلقاء۔ لا تثریب علیکم الیوم جاؤ تم آزاد ہو، آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں ہے

ظاہر ہے کہ قریش سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کا دشمن کوئی نہ تھا مگر خود ہادیٔ اسلام [illegible] فاتح تھا ایک

بے مثال اور عظیم الشان واقعہ ہے، ان حقائق کی موجودگی میں یہ کہنا کسی طرح
درست نہیں ہے، کہ اسلام کسی مسلم کو زندہ رہنے کا حق ہی نہیں دیتا
بلکہ حقیقت یہ ہے، کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے، جس نے اپنے پیروؤں
کو احترام انسانیت کا سبق دیا ہے، اور اسلام نے بغیر شدید ضرورت کے
سفک دماء اور قتل و خون ریزی ممنوع قرار دی ہے، مگر ایسی حالت میں
جب کہ چند بے رحم اور سنگدل انسانوں کے ہاتھوں امن عامہ کو خطرہ لاحق
ہو، خدا کی زمین پر معصیت و فساد کا دور دورہ ہو، اور مخلوق خدا کی کوئی قیمتی متاع
محفوظ نہ رہ سکتی ہو، تو اس وقت بلا شبہ اسلام اپنے پیروؤں سے مطالبہ
کرتا ہے، کہ وہ شمشیر بکف ہو کر میدان کارزار میں کود پڑیں، اور مفسدین کی شر
انگیزیوں سے مخلوق خدا کو نجات دلائیں، ظاہر ہے، کہ اگر ایسی حالت میں بھی
جہاد و قتال کی اجازت نہ دی جاتی، تو دنیا کے شریف و صالح انسانوں کو
زمین کے کسی گمنام گوشہ میں بھی امن و چین نصیب نہ ہوتا، اور دنیا کا نظام
تہ و بالا ہو جاتا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ	اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے
بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ	ذریعہ رفع نہ کرتا تو زمین کا نظام تباہ ہو جاتا
اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (الآیۃ)	لیکن اللہ تعالیٰ لوگوں پر مہربان ہیں

غرض یہ ایک ثابت بات ہے، اسلام نے جو تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے
یہ حکم فطرت اللہ کا عین اقتضا ہے، اور اس کی ضرورت سے کسی صاحب
عقل کو بھی انکار نہیں ہے، چنانچہ اسلام جو فطرت اللہ ہے، کیونکہ وہ دوسرا نام ہے،

اس سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ عالم انسانی کو دائمی بدامنی اور شورش کے جہنم میں جھونک دے، اور امن عالم کی عظیم ذمہ داری سے کنارہ کش ہو جائے چنانچہ فریضہ جہاد کا اصل منشا ہی یہ ہے کہ مفسدین فی الارض کے ناپاک عزائم کو ناکام بنا دیا جائے، اور عالم انسانی میں عالمگیر امن قائم کیا جائے،

كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (الآیۃ)	جب بھی یہ لوگ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو بجھا دیتا ہے، اور یہ لوگ زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ فسادیوں کو پسند نہیں کرتا۔

آیاتِ جہاد کی تطبیق

غیر مسلموں سے مسلمانوں کا تعلق کیا ہے، اور اسلام کی نظروں میں غیر مسلم کس سلوک کے مستحق ہیں، یعنی اسلام کی سیاست خارجیہ کی اساس کیا ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن کی آیات میں بظاہر تعارض و اختلاف معلوم ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے اس مسئلہ میں علماء متقدمین کے دو گروہ ہیں، جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے،

اس مسئلہ پر جو آیات قرآنی وارد ہوئی ہیں مفہوم و مصداق کے لحاظ سے ان کو تین قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) وہ آیات جن میں کفار سے حسن سلوک، احسان، عفو و درگذر اور رواداری کا برتاؤ برتنے کی تلقین کی گئی ہے۔

يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ○
(البقرة)

تم سے لڑتے ہیں اور مد اعتدال سے تجاوز مت کرو، بیشک اللہ تعالیٰ تجاوز کرنیوالوں کو ناپسند کرتا ہے

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا

تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے لڑتے نہیں ہو جو یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی سے نکال دے جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی دوست، اور مددگار بھیج دے،

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا

اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ ان سے صلح کر لیں،

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا
(النساء)

پس اگر وہ تم سے لڑائی نہ کریں اور آپ کو صلح کا پیغام بھیجیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان کے خلاف لڑنے کی کوئی وجہ جواز نہیں بنائی،

اس کی مضمون کی آیات بھی قرآن حکیم میں بکثرت ملتی ہیں،

قسم سوم:-

فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا

جب اشہر حرم گذر جائیں تو مشرکین کو جہاں

الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

پاؤ، قتل کردو، وہاں کو پکڑ لو، ان کا محاصرہ کرو
اور ان کے لیے ہر گھات میں بیٹھو۔ پس
اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ
دیں تو ان کا راستہ کھلا چھوڑ دو، بیشک اللہ
تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً

تم سب مل کر منظم طریق سے مشرکین سے
قتال کرو، جیسے وہ سب مل کر تمہارے
خلاف لڑتے ہیں۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ

تم اہل کتاب کے ان لوگوں سے جو اللہ اور
یوم آخر پر ایمان نہیں رکھتے اور جو چیزیں اللہ
اور رسول نے حرام کر دی ہیں ان کو حرام
نہیں سمجھتے اور دین حق کو قبول نہیں کرتے
اس وقت تک جنگ کرو، کہ وہ عاجز آ کر
جزیہ دینا قبول کر لیں۔

قرآن کریم میں اس مفہوم کی بہت سی آیات ملتی ہیں، جن میں غیر مشروط طور
پر یہ حکم دیا گیا ہے، کہ اہل کفر کو قتل کر دیا جائے۔ ان کو اطاعت پر مجبور کیا جائے
چنانچہ ان آیات کے اطلاق کے پیش نظر علماء سلف کا ایک گروہ اس امر کا قائل
ہے، کہ جہاد بالسیف بھی دعوت اسلامی کا ایک حصہ ہے یعنی جب کفار کے
سامنے اسلام پیش کیا جائے، اور دلائل و براہین سے اسلام کی صداقت

ثابت کر دی جائے، اور پھر بھی وہ لوگ دعوت اسلامی کو قبول نہ کریں، تو دعوت کی دوسری صورت یہ ہے، کہ جنگ و قتال سے ان کو راہ راست پر لایا جائے۔ یہ گروہ جہاد کی آیات مطلقہ سے پہلی دونوں قسم کی آیات کو منسوخ قرار دیتا ہے۔ مگر قطع نظر اس کے کہ اس صورت میں قرآن کی سینکڑوں آیات کو منسوخ کرنا پڑے گا، اور عقل سلیم ...... اس سے ابا کرتی ہے یہ مسلک آیات قرآنی کے مواقع، صدق، سیاق و سباق کے عدم فہم اور فراست قرآنی کے فقدان کا نتیجہ ہے، درحقیقت یہ ہے کہ یہ تمام آیات جن کو تین انواع میں تقسیم کیا گیا ہے، اپنے اپنے محل صدق اور دائرہ نفوذ میں محکم اور واجب العمل ہیں، چنانچہ قسم اول کی آیات جن میں حسن سلوک اور مروت و احسان کا حکم دیا گیا ہے، معاشرتی امور سے متعلق ہیں، اور جن میں اہل کفر کے مظالم پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے، وہ ایسے حالات سے مخصوص ہیں۔ جب کہ مسلمان صاحب شوکت نہ ہوں اور اہل کفر کے مقابلہ و دفاع کی قدرت نہ رکھتے ہوں، نیز ان احکام کی حیثیت انفرادی ہے یعنی ان کا تعلق افراد امت سے ہے، اور جہاد فرض کفایہ ہے جس کا تعلق پوری امت اور دولت اسلامیہ سے ہے، یعنی جہاد اس وقت تک جائز نہیں، جب تک کہ مرکز ملت، خلیفہ کی طرف سے باقاعدہ حکم جہاد نہ دیا گیا ہو، اور اسی صورت میں مصلحت عامہ یعنی پوری ملت کے مفاد کا لحاظ نہ کیا گیا ہو

جہاد کی آیات مطلقہ میں اگرچہ بظاہر غیر مشروط طور پر اہل کفر سے قتال کا حکم دیا گیا ہے، مگر یہ آیات سیاق و سباق اور محل صدق کے اعتبار سے

عام نہیں ہیں، بلکہ محارب قوم سے مخصوص ہیں، اور ظاہر ہے، کہ جو قوم مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہو، یا وہ دعوت اسلامی کی راہ میں مزاحمت کرتی ہو، یا اس کی مملکت میں مسلمانوں کے حقوق محفوظ نہ ہوں، اور وہ بے وجہ مسلمانوں کو تنگ کر رہی ہو، تو ان تمام صورتوں میں حکومت اسلامی کا فرض ہے، کہ وہ اس قوم کے خلاف فوجی اقدام کرے،

اب وہ آیات سامنے آتی ہیں جن میں مشروط طور پر جنگ و قتال کا حکم دیا گیا ہے، اور جن کو قسم دوم میں ذکر کیا گیا ہے ان آیات کا منشا ظاہر ہے کہ جب اہل کفر کی طرف سے کوئی ایسا قدم اٹھے جو فساد فی الارض پر منتج ہو سکتا ہو یعنی وہ دعوت اسلامی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریں، یا مخلوق خدا کو بے وجہ نشانۂ ظلم بنائیں، حقوق انسانی کو پامال کریں، اور اہل اسلام کو صرف اس وجہ سے ایذا دیں، کہ وہ مسلمان ہیں تو ان حالات میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے، کہ وہ اس مفسد قوم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں، اور اس کو اس کے اعمال کی عبرت ناک سزا دیں۔

اس طریق توفیق سے وہ تمام آیات قرآنی جو اسلام کی سیاست خارجیہ سے متعلق ہیں، اپنی اپنی جگہ محکم ہوں گی، اور اس کی ضرورت نہ رہے گی کہ بعض آیات کو منسوخ تسلیم کرنے کی قباحت مول لی جائے،

اسلام میں غیر مسلموں کے حقوقِ مدنیت

سوال کی دوسری شق یہ تھی، کہ اسلام غیر مسلموں کو اس شرط پر زندہ رہنے کا حق دیتا ہے، کہ وہ قبول جزیہ کے بعد محکومیت و ذلت کی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں، یعنی حکومتِ اسلامی میں حریتِ فکر، آزادی رائے، اور حقوق مدنیت صرف اسلام کے ماننے والوں ہی کو حاصل ہوتے ہیں، اور غیر مسلم ان بنیادی حقوقِ انسانیت سے یکسر محروم رہتے ہیں، اور از بسکہ جہادِ اسلامی اثر و نتیجہ کے اعتبار سے اقوامِ دنیا کی قومی اور نسلی جنگوں سے مختلف نہیں ہے کیونکہ ان اقوام کی جنگوں کا حاصل بھی یہی کچھ ہے، کہ کسی ملک پر قابض ہونے کے بعد حکومت کے نظم و نسق اور ملک کی پیداواری قوتوں کے مالک و متصرف بن جائیں، اور وہاں کے اصل باشندوں کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی آزادی سے محروم کر دیں، یہاں تک کہ وہ اپنے قدیم آبائی وطن میں محض مسافر اور غریب الدیار انسانوں کی طرح مجبوری و ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں،

اس مسئلہ کی دو حیثیتیں ہیں، ایک نظری اور اصولی حیثیت ہے اور دوسری عملی، اول الذکر حیثیت کتاب و سنت سے معلوم کی جا سکتی ہے. اور دوسری کتب تاریخ و سیر سے، مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر یہ

ضروری ہے، کہ اس کی دونوں حیثیتوں کو زیر بحث لایا جائے۔

گذشتہ بحث میں یہ بتایا جا چکا ہے، کہ اسلام کے احکامِ صلح و جنگ اور قوانین دول کا پس منظر ایک وسیع تر انسانی برادری اور ہمہ گیر امن و مساوات کے پرخلوص قیام کا عزم ہے چنانچہ اسلام کے مجموعہ قوانین جنگ اور بین الاقوامی آئین کو اگر نظرِ غائر سے دیکھا جائے، تو ان میں احترامِ انسانیت اعلیٰ اخلاق اور بلند تر سیرت و کردار کی مقدس روح کارفرما نظر آتی ہے، اور اسلام اپنے ماننے والوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ اجازت نہیں دیتا، کہ وہ انسانوں سے ایسا سلوک کریں، جو اخلاقی نقطہ نظر سے معیوب ہو، یا جس سے امن و صلح کے مقصد عظیم کو ٹھیس لگتی ہے، یہاں تک کہ دشمن کے اخلاق سوز اور خلاف انسانیت اعمال کے مقابلہ میں بھی اسلام نے اپنے ماننے والوں کو یہی حکم دیا ہے، کہ وہ قومی تعصب یا جذبہ انتقام کے تحت ہرگز اسلامی ضابطہ اخلاق اور ہمہ گیر اصول انسانیت کی خلاف ورزی نہ کریں، اور وہ اس کی پروا نہ کریں، کہ دشمن اس طرح کے منافی اخلاق و انسانیت اعمال کا ارتکاب کر رہا ہے، بلکہ مسلمانوں کو ہر حال میں عدل اختیار کرنی چاہیے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ

اے ایمان والو! تم اللہ کے لیے حق و انصاف کے گواہ بن کر پوری قوت سے کھڑے ہو جاؤ اور تم کو کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم کسی سے نا انصافی کرو، تم عدل

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدہ ۸)

کی راہ اختیار کرو کہ یہی راہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

غزوۂ احد میں قریش نے مسلمانوں کے ستر آدمی شہید کیے، اور حضرت حمزہؓ کو مثلہ کیا، تو اس سے قدرتی طور پر آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کو بہت رنج ہوا، اور کچھ مسلمانوں نے عزم کر لیا، کہ جب ہم ان پر غالب آئیں گے، تو ان کے دو چند آدمی قتل کریں گے، اور ان سے ایسا ہی سلوک کریں گے، جیسا انہوں نے کیا ہے، مگر خدائے قدوس نے اس بات کو ناپسند فرمایا، کہ ملت اسلامی جس کے ظہور کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ دنیا سے ظلم و نا انصافی کو ختم کرے اور عالم انسانی کو عدل و راست بازی کی راہ دکھائے، کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرے جس سے اس کی اخلاقی عظمت کو ٹھیس لگتی ہے، چنانچہ مسلمانوں کو اس عزم سے باز رکھنے کے لیے ذیل کی آیت نازل ہوئی،

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (النحل)

اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو ان کو اتنی ہی اذیت دو جتنی تمہیں دی گئی ہے اور اگر تم صبر کرو تو اہل صبر کے لیے یہ بہت اچھی بات ہے،

اس پر آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا :-

بَلْ نَصْبِرُ

ہم صبر ہی کریں گے،

یہ محسن نہ مکرہ فیاضانہ سلوک ان کینہ پرور اور سخت گیر انسانوں سے کیا

جارہا ہے جو اس وقت کرۂ ارض میں سب سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔ مگر قرآن حکیم غیر مسلموں کے غیر محارب افراد و قبائل سے اوبھی یاد مروت و احسان کی اجازت دیتا ہے

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنہ)	اللہ تعالیٰ تم کو ان کفار و مشرکین کے ساتھ مروت و احسان کرنے سے منع نہیں کرتا جو دین کے معاملہ میں تم سے لڑے نہیں ہیں اور انھوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا نہیں ہے، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف پسند لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے، کہ اسلام کسی انسان کو محض اختلاف عقیدہ و مسلک کی بنا پر انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم نہیں کرتا، بلکہ وہ ہر حال میں قیام بالقسط، اختیار عدل اور احترام اخوت البشری کا حکم دیتا ہے، بلکہ ہر ممکن صورت میں اہل کفر سے بہترین سلوک اور مروت و احسان کی تلقین کرتا ہے۔ ہاں! یہ صحیح ہے، کہ اسلام ان لوگوں کو کسی طرح کی رعایت نہیں دیتا جو خدا کی زمین کو فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنانا چاہتے ہوں، اور مخلوق خدا کو بے وجہ نشانۂ ستم بنا رہے ہوں، کیونکہ اسلام اپنے سامنے ایک بلند تر مقصد رکھتا ہے جس کی تکمیل کے لیے بہر حال ایسے شریر عناصر کا استیصال ناگزیر ہے، اور صرف اسی غرض کے لیے جہاد بالسیف کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔

انسانی حریت ومساوات کا غیر مبہم اعلان

عالم انسانی آج تک حریت و مساوات کے سرچشمہ حیوان کی تلاش میں سرگرداں ہے، مگر افسوس ہے کہ اس کے مار صافی کی ایک بوند بھی آج تک اس کے لب تشنہ کو نصیب نہیں ہوسکی، اور جس قدر انسان کی تشنہ لبی بڑھ رہی ہے، اور اس کے دن طلب میں شدت پیدا ہورہی ہے، اسی قدر اس کی منزل مقصود اس کی نگاہوں سے دور ہوتی جارہی ہے، مگر حیرت ہے کہ صدہا ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی اس کا قدم اسی غلط راہ پر گامزن ہے، اے کاش دور حاضر کے انسان کو یہ کون بتائے، کہ یہ پرخطر اور کٹھن منزل علم فلاطون سے نہیں بلکہ درد دل ہی کے ذریعے طے ہوسکتی ہے، ؎

برفلک تمپیا تر کہ بانہ شبیخوں بہ یک ذرّہ درد دل از علم فلاطوں بہ

اگر فی الواقع انسان کو حریت وآزادی اور امن ومساوات کی خواہش ہے، تو اس کے لیے ناگزیر ہے، کہ وہ پہلے نظریات انسانی کی ذہنی غلامی سے آزاد ہوکر خدائی فلسفہ زندگی کو اپنا رہبر بنالے، اور اگر وہ ایک طرف حریت و آزادی کا نعرہ بلند کرتا رہے، اور دوسری طرف اس کا اپنا ذہن وفکر انسانوں کے بنائے ہوئے فلسفہ ہائے زندگی کی زنجیروں میں مقید رہے، تو اس کی خواہش کی تکمیل دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے

آج عالم انسانی جن شدائد وخطرات میں گھرا ہوا ہے، ان کا اصل سرچشمہ ننگ ونسل کا امتیاز اور وطنی عصبیت ہے، مگر کتاب اللہ

نے چند لفظوں میں اس عقدہ کو حل کر دیا ہے،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الآیۃ)

اے لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا، اور پھر شعوب و قبائل میں تقسیم کیا، تاکہ تم ایک دوسرے سے ممیز نام کے ذریعہ پہچانے جا سکو بے شک تم میں معزز تر اور بزرگ تر وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا ترس اور با عمل ہے۔

"شعوب" سلسلہ نسب کی ابتدائی کڑی ہے جو بعد میں آنے والی کڑیوں کے لیے مبدا کی حیثیت رکھتی ہے اور بعد میں آنے والی کڑیوں کو "قبائل" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے قرآن حکیم کا منشا یہ ہے، کہ سلسلہ نسب ابتدا سے انتہا تک نفس انسانیت پر اثر انداز نہیں ہوتا، اور ہر انسان بحیثیت انسان کے بنیادی حقوق انسانیت کا مستحق ہے،

احادیث نبوی میں اس مسئلہ کو اس سے زیادہ وضاحت سے پیش کیا گیا ہے، چنانچہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں سردار دو عالم صلعم نے اور بہت سے اہم اجتماعی مسائل کے علاوہ اس مسئلہ پر بھی بالفاظ ذیل تبصرہ فرمایا:۔

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ كُلُّكُمْ بَنُو آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ إِنَّ

اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا

أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ، لَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ إِلَّا بِالتَّقْوَى	بیشک اللہ کے نزدیک معزز وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی اور نیک ہے اور کسی عربی کو عجمی پر تقویٰ کے سوا کوئی دوسری وجہ فضیلت نہیں ہے،
(جمہرۃ الخطب)	

ان نصوص کتاب و سنت سے ظاہر ہے، کہ اسلام میں ہر انسان نفس انسانیت کی بنا پر ہر قسم کے تمدنی، تہذیبی اور معاشی حقوق کا مستحق ہے اور کوئی خارجی امتیاز انسان کو ان حقوق سے محروم نہیں کرتا، سوائے اس ایک صورت کے جس کا سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے، کہ انسان خود ہی کسی فساد اور فسق و معصیت سے اپنے آپ کو اس سے محروم کر دے،

حکومت اسلامی میں غیر مسلم رعایا کے حقوق

یہاں تک جو [illegible] ہے، وہ انسانیت عامہ سے متعلق ہے، مگر ان غیر مسلموں کی حیثیت اس سے مختلف ہے، جو حکومت اسلامی میں باقاعدہ رعیت کے طور پر رہتے ہیں، یعنی ان لوگوں کے حقوق جان و مال کا تحفظ اور ان کے حقوق مذہبی کا احترام حکومت اسلامی کے لیے اخلاقی حیثیت کے علاوہ قانونی اور آئینی (دستوری) لحاظ سے بھی ضروری ہے، یہ اسلامی پالیٹکس کا ایک مستقل باب ہے جس کی تفصیلی تشریح کی ضرورت ہے، اور اس وقت یہی مسئلہ ہمارا موضوع بحث ہے،

حکومت اسلامی کی غیر مسلم رعایا کو شرعی اصطلاح میں ذمی یا اہل الذمہ

کہا جاتا ہے، اور اس لفظ کا مفہوم بالکل ظاہر ہے، کہ جو غیر مسلم حکومت اسلامی کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں، ان کے حقوق جان ومال کا تحفظ حکومت اسلامی اپنے ذمہ لے لیتی ہے اور اس بنا پر یہ لوگ ذمی کہلاتے ہیں، مگر اعداء دین کی بد ذوقی پر ماتم کرنا چاہیئے، کہ انہوں نے ایسے مقدس لفظ کو جو غیر مسلم رعایا کے حقوق انسانیت کی ترجمانی کرتا ہے، اتنا خوفناک بنا دیا ہے کہ اس کے سنتے ہی جاہل اور ناواقف لوگوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے فیا للعجب!

حکومت اسلامی میں غیر مسلم رعایا سے جس طرح کا مساویانہ اور فیاضانہ سلوک کیا جاتا ہے اس کی مثال عصر حاضر کی کسی مملکت میں نہیں ملتی، حالانکہ اقوام حاضرہ کا دعویٰ یہ ہے، کہ آج تمدن انسانی ارتقاء کی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے، اور ان کے نزدیک سیاست دینی زمانہ ماضی کی مقدس یادگار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اور موجودہ فضا کے لیے ناسازگار خیال کیا جاتا ہے، مگر ان سے کم از کم اتنا تو دریافت کیا جا سکتا ہے، کہ تم نے آج تک کوئی ایسا نظام سیاست و اجتماع تیار کیا ہے جو ملکی اور غیر ملکی گورے اور کالے کا امتیاز، اور غیر امتیازی کی تمیز نہ کرتا ہو، بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو بلا لحاظ خون و نسب اور شہرہ و ملک مساوی طور پر حریت فکر اور حقوق مدنیت عطا کرتا ہو! اگر ایسا نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے تو پھر کیا حرج ہے، کہ تم اس دینی نظام سیاست کو بھی ایک دفعہ آزما دو جس کا دعویٰ یہ ہے، کہ وہ تمام نوع انسانی سے یکساں سلوک کرتا ہے، اور اس کی نظر میں احمر و اسود، ملکی و غیر ملکی کی کوئی تمیز نہیں ہے،

ہم ذیل میں نظام اسلامی کی ہمہ گیر افادیت کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا، کہ اسلام صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی آیۂ رحمت ہے۔

غیر مسلموں کے تہذیبی اور مذہبی حقوق

دشمنان اسلام نے بعض بوشش اغراض کی بنا پر اسلام پر یہ الزام لگایا ہے، کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم مذہبی اور تہذیبی آزادی سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے، کہ حکومت اسلامی میں غیر مسلموں کو ہر طرح کی ثقافتی اور مذہبی رعایتیں حاصل ہوتی ہیں، اور اس سلسلہ میں ان پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی، جس سے ان کی مخصوص ثقافت علوم و فنون، اور مراسم دینی پر زد پڑتی ہو۔ چنانچہ عہد نبوت میں نصاریٰ نجران، یہود خیبر اور کچھ دوسرے قبائل سے جو معاہدے طے پائے، ان میں ان لوگوں پر کوئی ایسی پابندی نہیں لگائی گئی تھی جس سے ان کے مخصوص مذہبی شعائر یا تہذیب و ثقافت کو نقصان پہنچتا۔ نصاریٰ نجران کے معاہدہ میں بایں الفاظ ان کے بنیادی حقوق کی وضاحت کی گئی ہے۔

على أموالهم وأنفسهم وأرضهم	ان کے مال، جان، زمین، مذہب، غائب
وملتهم وغائبهم وشاهدهم	حاضر، قبیلہ، عبادت گاہوں اور ہر اس چیز
وعشيرتهم وبيعهم وكل ما تحت	پر جو ان کے تصرف میں ہے، یہ معاہدہ
أيديهم من قليل أو كثير (كتاب الخراج)	حاوی ہوگا،

اسی طرح زمانہ خلافت راشدہ میں غیر مسلم تو ام کو ہر طرح کی مذہبی اور ثقافتی آزادی حاصل تھی چنانچہ حذیفہ بن الیمان نے ماہ دینار والوں کو جو تحریر لکھ کر دی تھی اس میں یہ الفاظ موجود تھے۔

لا یغیرون عن ملتھم ولا	ان کو مذہب سے برگشتہ نہ کیا جائے گا اور
یحال بینھم و بین شرائعھم	نہ ہی ان کے مذہبی اور ملی معاملات میں
(الاستغابۃ)	کوئی رکاوٹ ڈالی جائے گی۔

جرجان کی فتح کے بعد اہل جرجان سے جو معاہدہ ہوا اس میں یہ بھی الفاظ تھے۔

لھم الامان علی انفسھم واموالھم	ان کی جان ومال اور ملت وشریعت کے
وملالھم وشرائعھم (طبری)	معاملہ میں ان کے لیے امان ہے۔

آذربائیجان کے معاہدہ میں بھی قریب قریب یہی الفاظ تھے۔

الامان علی انفسھم واموالھم و	ان کی جان ان کے اموال، ان کی ملت ان
ملالھم وشرائعھم (الفاروق بحوالہ طبری)	کی شریعت پر امان حاصل ہوگا۔

خلافت اسلامی میں قانونی اور عدالتی مساوات

جہاں تک قانونی اور تعزیری مساوات کا تعلق ہے، قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں تاکید کی ہے کہ غیر مسلموں سے پورا انصاف کیا جائے اور یہ حقیقت ہے کہ اسلامی عدالت و قانون کی نظر میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

فان حکمت فاحکم بینھم بالقسط	اگر اہل کتاب کے حکم نہیں تو

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (المائدہ) — عدل وانصاف کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کریں، کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے

حضرت عمر نے ابو موسیٰ اشعری گورنر کوفہ کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس کے چند الفاظ یہ ہیں:-

اما بعد فان القضاء فريضة محكمة وسنة متبعة سار بين الناس في وجهك ومجلسك وعدلك (طبقات الفقهاء)

قضاء فریضہ محکم اور واجب الاتباع سنت ہے تم لوگوں کے درمیان اپنے حضور میں اپنی مجلس میں اور عدالت میں مساوی سلوک کرو

اسلام نے غیر مسلم رعایا کو جس طرح کے مساوی حقوق دیئے ہیں ان سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا یعنی اسلامی شریعت میں مسلمانوں اور ذمی رعایا کے حقوق جان ومال میں کوئی قانونی فرق نہیں ہے۔ اور ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر رکھی گئی ہے یعنی اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے، تو شرعی قانون کے مطابق اس مسلمان سے قصاص یا دیت لی جائے گی، چنانچہ یہ مسئلہ باقاعدہ قانون کی شکل میں کتب فقہ میں موجود ہے

فان بذلوها فلهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين (هدايه كتاب السير)

اگر وہ جزیہ دینا قبول کریں، تو وہ ہر طرح کے نفع ونقصان میں مسلمانوں کے برابر ہوں گے

زمانہ خلافت راشدہ میں اسی پر عمل رہا، چنانچہ حضرت عمر کے دور خلافت

میں ایک مسلمان نے یہودی کو قتل کر دیا، جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا، تو انھوں نے اس کو ایک بڑا سانحہ تصور کیا، اور فرمایا، میرے زمانہ خلافت میں انسانوں کا خون ہو! میں تم کو قسم دلاتا ہوں، کہ جسے قاتل کا علم ہو، وہ مجھے بتائے، بکر بن شداخ نے کہا، امیر المومنین! اس کا قاتل میں ہوں، فرمایا۔ تو پھر تم سے قصاص لیا جائے گا۔ یا اپنی برأت بیان کرو

اسی طرح حضرت علیؓ کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کر دیا، یہ معاملہ حضرت علی کے سامنے پیش ہوا، تو انھوں نے قصاص کا حکم دیا لیکن مقتول کے وارثوں نے قاتل کو معاف کر دیا، مگر پھر بھی حضرت علی نے ورثہ سے دریافت کیا، کہ تمھیں کسی نے دھمکی تو نہیں دی! ورثہ نے کہا کہ ہم نے اپنی مرضی سے اس کو معاف کر دیا ہے، کیونکہ اسے قتل کرنے سے ہمارا بھائی زندہ نہیں ہو سکتا، اور قاتل نے اس کا معاوضہ ادا کر دیا ہے

حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد خلافت میں حیرہ کے ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کر دیا، امیر المومنین نے وہاں کے گورنر کو لکھا، کہ قاتل کو مقتول کے ورثہ کے حوالہ کر دو، وہ چاہیں تو اسے قتل کریں یا معاف کر دیں، چنانچہ قاتل کو ورثہ کے حوالے کر دیا گیا، اور انہوں نے اسے قتل کر دیا

مندرجہ بالا واقعات کے علاوہ تاریخ اسلامی میں اور بھی اس طرح کے واقعات ملتے ہیں، جن کی تفصیل اس مقام پر مشکل ہے

اس کے علاوہ اسلام نے غیر مسلم اقوام کی داخلی عدالتی خود مختاری قائم

گئی ہے، چنانچہ نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا گیا تھا، اور جس کا متن ابن سعد وغیرہ کتب تاریخ میں موجود ہے، اس میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

غیر مسلموں کے حقوق معیشت

حکومت اسلامی میں مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کو بھی تمام اقتصادی اور معاشی حقوق حاصل ہوتے ہیں، چنانچہ سطور بالا میں جن معاہدات کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں صراحت سے ان کی جائداد، زمین اور روپے پیسے کا ذکر موجود ہے، بالخصوص نصاریٰ نجران سے جو معاہدہ ہوا، اس میں خود آنحضرت صلعم نے وکل ما تحت ایدیھم من قلیل او کثیر کے عمومی الفاظ سے ان کے حقوق مال کو تسلیم کیا۔

حضرت عمرؓ اپنے عمال حکومت کو بار بار تاکید فرماتے تھے کہ اہل الذمہ سے کیے گئے معاہدات سختی سے عمل کیا جائے، اور ان کی جان و مال پر کسی طرح کی زیادتی نہ کی جائے، چنانچہ فتح شام کے بعد آپ نے ابو عبیدہ کو تحریر فرمایا تھا،

وامنع المسلمین من ظلمھم	آپ مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے، ان کو نقصان
والاضرار بھم واکل اموالھم الا	پہنچانے اور ان کا مال غصب کرنے سے
بحلھا ووف لھم بشرطھم الذی شرطت	روک دیں، اور معاہدہ میں جو حقوق آپ نے
لھم فی جمیع ما اعطیتھم (کتاب الخراج)	تسلیم کیے ہیں ان سب کی تکمیل کریں۔

بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے جانشین کو یہ

وصیت فرمائی تھی،

اوصیہ بذمۃ اللہ ورسولہ	میں اس کو اللہ اور اس کے رسول کے عہد
ان یوفی لہم بعہدہم	کی وصیت کرتا ہوں، کہ وہ ذمیوں کے
(بخاری)	حقوق پورے کرے،

اس کا نتیجہ یہ تھا، کہ کوئی مسلمان ذمیوں کے اموال واملاک کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا، اور حضرت عمرؓ نے تو اس معاملہ میں اس حد تک مبالغہ کیا، کہ مسلمانوں کے لیے ان کی زمینیں خریدنا ممنوع قرار دے دیا، کیونکہ اس سے یہ ممکن تھا کہ تمام زمینیں اہل عرب کے قبضہ میں آجاتیں، اور ذمی رعایا کسب معاش سے محروم ہو جاتی،

دولت بنی امیہ کے جابر حکمرانوں نے ذمیوں کی کچھ زمینیں غصب کرلی تھیں اور ان کو شاہی خاندان میں جاگیر کے طور پر تقسیم کر دیا تھا مگر حضرت عمرؓ ابن عبد العزیز نے ایسی تمام زمینیں ذمیوں کو واپس کر دیں، چنانچہ ایک ذمی نے عباس بن الولید کے خلاف دعویٰ دائر کیا، کہ اس نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے، حضرت عمرؓ نے عباس بن الولید سے مخاطب ہو کر کہا، کہ تم اس کا کیا جواب دیتے ہو، کہا یہ زمین مجھے ولید نے جاگیر کے طور پر دی ہے، اور میرے پاس اس کی سند موجود ہے، آپ نے فرمایا، کہ خدا کی کتاب ولید کی سند سے مقدم ہے اور ذمی کو زمین واپس دلادی،

اس کے علاوہ حکومت اسلامی میں اہل ذمہ کو تجارت، زراعت

اور ہر طرح کے کاروبار کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے، چنانچہ زمانہ خلافت
راشدہ میں ان لوگوں کو ہر طرح کی کاروباری آزادی حاصل تھی، بلکہ ان کو اس
سلسلہ میں خاص رعایتیں دی جاتی تھیں، تاکہ ملک میں اشیاء تجارت کی
نقل و حرکت وسیع پیمانہ پر جاری رہے، اور عوام کو کسی چیز کے حصول میں
دقّت [illegible] پیش نہ آئے۔

سازشی عناصر سے حسن سلوک

دنیا کی کوئی حکومت ایسے لوگوں کو قطعاً معاف نہیں کرتی، جو در پردہ
مملکت کے دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہوں اور سیاسی نقطۂ نظر سے یہ
ہمیشہ ایک سنگین تر جرم تصور کیا جاتا رہا ہے جس کی سزا قتل یا کم از کم [illegible]
جلاوطنی ہی ہو سکتی ہے، اور دنیا کی حکومتوں میں ایسے لوگوں کے ساتھ کسی
رعایت کا تصور بھی نہیں کیا جاتا، مگر خلافت اسلامی کی یہ ایک بہت بڑی خصوصیت
ہے، کہ یہ ایسے شریر عناصر سے بھی حتی الامکان بہتر سلوک کرتی ہے، چنانچہ
تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے آپ معلوم کر سکیں گے، کہ خلافت راشدہ
کے مقدس دور میں کئی ایسے قبائل یا اشخاص کو جو اس جرم کے مرتکب ہوئے
تھے، نوعیت جرم کے مقابلہ میں کمتر سزا دی گئی، یعنی کافی مہلت دینے کے
بعد زیادہ سے زیادہ ان کو جلا وطن کیا گیا، اور پھر اس میں بھی ان کو یہ رعایت
دی گئی، کہ ان کے املاک و مقبوضات کا ان کو باقاعدہ معاوضہ دیا گیا اور
ان کے لیے دوسری جگہ قیام کرنے کا حکومت کی طرف سے
انتظام کیا گیا،

عرب میں و شام اکے لوگ در پردہ رومیوں سے ساز باز رکھتے تھے اس علاقہ کے حاکم عمیر ابن سعد نے حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا کہ ان کے پاس جس قدر چاند ادیں اور مال و مویشی ہیں ان کو باقاعدہ طور پر شمار کر کے ایک ایک جزئی دگنی قیمت ان کو دے دو اور ان سے کہہ دو کہ دوسری جگہ چلے جائیں، اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو ان کو ایک سال کی مہلت دو، مگر چونکہ وہ اس رعایت کے بعد بھی شرارتوں سے باز نہ آئے اس لیے بالآخر ان کو جلا وطن کر دیا گیا،

فدک کے یہودیوں کو جس وقت پولیٹیکل سازشوں کی وجہ سے جلا وطن کیا گیا تو ان کے باغات اور زمینوں کی آدھی پوری قیمت ادا کر دی گئی مگر نجران کے عیسائیوں سے جو بہترین سلوک کیا گیا وہ سب سے زیادہ حیران کن ہے، چنانچہ ان کو جب عرب سے نکالا گیا اور شام و عراق میں آباد کیا گیا، تو ان کو جو دستاویز لکھ کر دی گئی، اس میں خیل کی رعائتیں مرقوم تھیں،

(۱) یہ لوگ جہاں قیام کرنا چاہیں، وہاں کے حکام ان کو رہائش اور زراعت کے لیے زمین دیں،

(۲) چوبیس ماہ تک ان سے جزیہ نہ لیا جائے،

(۳) جس مسلمان کے پاس یہ لوگ فریاد لے کر جائیں، وہ ان کی مدد کرے،

(الفاروق بحوالہ کتاب الخراج ص۱۲۱)

یہ بحث اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس قابل ہے، کہ اس کے تمام

پہلوؤں کو زیر تحریر لایا جائے مگر چونکہ یہ ایک مستقل بحث ہے، اور ہمارے
اصل موضوع (اسلام کا نظریہ جہاد) میں اس کے تفصیلی گوشوں کو چھیڑنا نہ
صرف لازمی نہیں بلکہ غیر موزوں بھی ہے، اس لیے اب اس بحث کو ختم کیا
جاتا ہے۔ مگر مذکورہ تصریحات سے اتنا ضرور ثابت ہے کہ جہاد اسلامی کی
غرض وغایت ہرگز یہ نہیں ہے، کہ اس کے ذریعہ ایسی ریاست قائم کیجائے
جو صرف اسلام کے ماننے والوں ہی کو حقوق انسانیت عطا کرے، اور
دوسری اقوام وملل اس کے ماتحت انسانیت کے بنیادی حقوق سے
محروم ہوں، بلکہ حقیقت یہ ہے، کہ جہاد اسلامی کے ذریعہ ایک ایسی مثالی
ریاست (آئیڈیل سٹیٹ) قائم کی جاتی ہے جو بلالحاظ عقیدہ وفکر اور
رنگ ونسل تمام انسانوں کو حریت فکر، آزادی حیثیت اور تمام دوسرے
حقوق انسانیت عطا کرتی ہے

نظام اسلامی سے غیر مسلموں کی وجہ نفرت

گذشتہ بحث سے یہ سوال پیدا
ہوتا ہے، کہ نظام اسلامی اگر فی الحقیقت اپنے اندر اتنے محاسن رکھتا ہے
تو پھر اس کی کیا وجہ ہے، کہ غیر مسلم نظام اسلامی کا نام سنتے ہی لرزہ براندام
ہو جاتے ہیں؟

یہ سوال بظاہر تو وزن دار معلوم ہوتا ہے، اور ہم بھی تسلیم کرتے ہیں،
کہ غیر مسلموں کو اتنی نفرت کسی چیز سے نہیں ہے، جتنی کہ حکومت اسلامی
کے نام اور بالخصوص جہاد، جزیہ اور ذمی کی اسلامی اصطلاحات سے

ان کو نفرت ہے مگر اس شدید نفرت کا باعث چند خارجی امور ہیں جن کا نظام اسلامی سے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ دورِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے بعد اسلامی حکومت یا خلافت اسلامیہ کے نام سے جو حکومتیں بنتی رہی ہیں ان میں سے بیشتر حکومتیں حقیقت میں اسلامی حکومتیں نہ تھیں اور ان میں وہ سب کچھ ہوتا رہا جو کسی لادینی سلطنت میں ہو سکتا ہے مگر چونکہ ان کا ظاہری لیبل اسلام ہی تھا اس لیے دوسری قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ حکومت اسلامی کا نظام سیاست ایسا ہی ہے۔ حالانکہ اس میں نظام اسلامی کا کوئی قصور نہ تھا، بلکہ قصور ان حکمرانوں کا تھا جو اسلام کے نام سے لادینی طرزِ حکومت کا ظلم و نسق چلا رہے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عہد حاضر میں عقل و تعقلیت اور انصاف و دیانت کی جگہ قومی تعصب نے لے لی ہے۔ یعنی اقوامِ حاضرہ کے نزدیک اشیا کے حسن و قبح کا صرف ایک ہی معیار ہے، کہ جو چیز اپنی قوم کی طرف منسوب ہے، وہ اچھی ہے، اور جو کسی دوسری قوم سے نسبت رکھتی ہے، وہ بری ہے۔ بس اسی معیار پر ہر چیز کو پرکھا جاتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں ان کو کسی دوسری دلیل کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر مسلمانوں کے ساتھ ان اقوام کو تعصب زیادہ اندھا ہونا چاہیئے، کہ انھوں نے مسلسل ایک ہزار سال تمام کرۂ ارض پر حکومت کی ہے، اور وہ اس عرصہ میں دنیا کی تمام بڑی بڑی قوم کو طوعاً و کرہاً اقتدار اسلامی کے آگے سرنگون ہونا پڑا، مگر دل سے کوئی

قوم فطرتاً اس بات کو برداشت نہیں کرتی کہ اس کی مسند حکومت پر کوئی دوسری قوم قابض ہو، چنانچہ یہ قومیں مرکزیت اسلامی کو فنا کرنے کے لیے ابتدا ہی سے در پردہ سازشیں کرتی رہیں، اور خود مسلم حکمرانوں کی نالائقیوں اور ملت کے غداروں کی سیہ کاریوں نے دشمنان اسلام کے عزائم کو اور زیادہ تقویت بہم پہنچائی۔ چنانچہ اب بھی مملکت پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک اسی دوگونہ کشمکش میں مبتلا ہیں) اور بالآخر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے یعنی مرکزیت اسلامی ان کے ہاتھوں تباہ ہوئی، اور شیرازۂ ملت بکھر گیا، اور بالآخر وہ وقت آ پہنچا جس کا ان اقوام کو صدیوں سے انتظار تھا، اور اب انہوں نے مسلمانوں سے جی بھر کر انتقام لینا شروع کیا چنانچہ تاسنت بھی ایک حد تک اس کام سے فارغ ہو چکی تھی، اور ہندو اور یہود کو اب اس کا موقع ملا ہے، یعنی بیت المقدس کی صلیبی جنگوں، ہسپانیہ کی حسرت ناک تباہی، طرابلس الغرب اور سوڈان کے مسلمانوں کے نسل عام، سقوط مصر و شام اور سلطنت ترکیہ کی بربادی کی داستانیں اب پرانی ہو چکی ہیں، مگر یہود کے ہاتھوں فلسطین کی سرزمین اور ہندو کے ہاتھوں بہار، دہلی، مشرقی پنجاب، حیدرآباد اور کشمیر کی سرزمین کا چپہ چپہ مسلمانوں کے خون ناحق سے اب تک لالہ زار بنا ہوا ہے، اور فرزندان توحید کی لاشیں اب بھی کہیں کہیں بکھری پڑی ہیں، جو تاریخ انسانی کی سب سے بڑی سفاکی کی یاد دلا رہی ہیں۔ ہاں! مگر ان شہیدان حق کی روحیں بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہو کر فریاد کر رہی ہیں کہ کیا تیری دنیا میں آج کوئی نہیں،

جلا کیوں بے گناہ انسانوں کے خون ناحق کا انتقام ہے؟

قصہ کوتاہ یہ کہ دشمنان اسلام وہ تین صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کر رہے ہیں، وہ ایک بہت بڑی طولانی داستان ہے جو اپنے اندر کرب و درد اور دل آویزی کی متضاد کیفیتیں رکھتی ہے ؎

صد بیت درد دل آویز داستانے ہست | کہ ذوق نیش دہد چوں دو ساز زرگرد

بہر حال ان اقوام کو مسلمانوں سے اس قدر شدید سیاسی اور مذہبی تعصب ہے کہ ان کی ہمدردی ان کے زخمی دلوں پر نمک پاشی کا کام کرتی ہے، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے، کہ وہ کسی ایسے نظام سیاست کو تسلیم کریں، جو اسلام اور مسلمانوں سے نسبت رکھتا ہے۔

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ایک دردناک حقیقت ہے، جو الفاظ بن کر زبان قلم پر آگئی ہے، مگر اس سے مقصد صدیوں کی رقابت کو ابھارنا نہیں ہے، بلکہ یہ بتانا مقصود ہے، کہ موجودہ اقوام (جس میں مسلمان بھی شامل ہیں) ماضی کی تلخ یاد کو بھلا دیں، اور آئندہ کے لیے سوچ سمجھ کر ایسی راہ اختیار کریں جس سے تمام دنیا کے انسان بین الاقوامی امن اور مستقل امن و خوشحالی سے ہمکنار ہو سکے، اور وہ صرف اسلام کی راہ ہے۔

جنگ اور جہاد کا اصطلاحی فرق

ہر زبان کے ادبی، سیاسی اور علمی لٹریچر میں ایسے الفاظ کی کمی نہیں جن کے زبان پر آتے ہی انسانی ذہن و دماغ پر نفرت و حقارت اور دہشت و انقباض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، مگر اس کے باوجود وہ حیرت انگیز طریق سے کثیر الاستعمال اور مقبول عام ہیں، چنانچہ جنگ اور اس کے ہم معنی الفاظ اسی زمرہ میں شامل ہیں۔

لفظ جنگ اپنے دامن میں تاریخ انسانی کی بے شمار خونیں اور جگر گداز داستانیں لیے ہوئے ہے جن کے تصور ہی سے جگر پاش پاش ہونے لگتا ہے، اور حضرت انسان کی ستم کاریاں مجسم شکل میں آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آنے لگتی ہیں۔

جنگ کیا ہے؟ انسانی وحشت و بہیمیت کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ، کہ تاریخ کا کوئی دور اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہا، اور معمورۂ ارضی کا کوئی خطہ، کوئی ملک اور کوئی بستی ایسی نہیں ہے، جو جنگ کی شعلہ باریوں سے بارہا خاکستر نہ ہو چکی ہو، غرض جنگ کا لفظ انسانی قساوت قلبی، بیرحمی اور سنگ دلی کی درد انگیز و منحوس یادگار ہے جس کی قاہرانہ گرفت سے، امن و سلامتی کے جلیل القدر داعی اور اخلاقیات کے عظیم المرتبت پیغامبر

بھی نہیں بچ سکے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے، کہ جنگ عالم انسانی کی ایک دائمی اور مستقل بیماری ہے جس کی دوا کسی انسانی دارالشفا سے ہو سکتی ہے اور نہ ہو گی

ان تنج منہا تنج من ذی عظیمۃ ۔۔۔ الا فانی لا اخالک ناجیاً

غرض جنگ کی ہلاکت خیزیوں سے کوئی قوم اور کوئی ملک نہیں بچ سکا۔ مگر پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے جس سرزمین میں جنم لیا، وہ جنگ کی اہلیت ناکیوں سے ایک گونہ اختصاص رکھتی تھی یعنی عرب کے باشندوں کے لیے قتل و غارت گری، جنگ و قتال، اور غصب و نہب ہی سب سے زیادہ محبوب مشغلہ تھا۔ اور انھوں نے دوسری اقوام کی نسبت جنگ کو بہت زیادہ بھیانک، مکروہ اور خطرناک بنا دیا تھا، چنانچہ اہل عرب کی جدت طراز طبیعت نے جنگ کے لیے جن ہولناک الفاظ کا انتخاب کیا، اور اپنے کمال سپہ گری، شجاعت و بسالت، حملہ و ہجوم اور قتل و غارت کے لیے انھوں نے جس طرز کی تشبیہیں اور استعارے استعمال کیے ہیں، ان سے ان کے جنگجویانہ مذاق کا پتہ چلتا ہے۔

دراصل کسی قوم کا قومی شعور، ملی سیرت اور اجتماعی کردار معلوم کرنے کے لیے اس کے ذخیرۂ ادب سے بڑھ کر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور عرب قبل الاسلام کا ادبی سرمایہ آج بھی محفوظ ہے جس سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے، کہ حرب و قتال ہی ان کی سیرت ملی کا بنیادی عنصر تھا چنانچہ فن حرب سے ان کو جس قسم کا طبعی لگاؤ تھا، وہ اس بات سے ظاہر

ہے، کہ یہ لوگ اپنے رجزیہ اشعار اور قصائد میں جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے، وہ ان کی بے دریغانہ غارت گری اور سفاکانہ قتل و خون ریزی کے کارنامے ہی تھے، اور وہ اس وصف میں حد اعتدال سے اتنے بڑھ گئے تھے کہ رحم دلی، عفو، درگذر اور دشمن سے مروت و احسان ان کے نزدیک سب سے زیادہ مذموم اور قبیح صفات متصور ہوتی تھیں، چنانچہ ایک شاعر اپنی قوم کی بزدلی کا ماتم کرتے ہوئے کہتا ہے،

لکن قومی وان کانوا ذوی عددٍ　　　لیسوا من الشر فی شیئٍ وان ھانا
یجزون من ظلم اھل الظلم مغفرۃً　　　ومن اساءۃ اھل السوء احسانا
کان ربک لم یخلق لخشیتہ　　　سواھم من جمیع الناس انسانا
فلیت لی بھم قوما اذا رکبوا　　　شنوا الاغارۃ فرسانا ورکبانا

میری قوم اگرچہ کثیر العدد ہے، لیکن لڑائی کے معاملہ میں ناکارہ ہے اگرچہ
یہ لڑائی کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو،
یہ ظالم لوگوں کے ظلم کا بدلہ عفو و بخشش سے دیتی ہے اور بروں کی
برائی کا بدلہ احسان سے!
گویا تیرے رب نے اپنی خشیت و خوف کے لیے سوائے اس قوم کے
کسی دوسرے کو پیدا ہی نہیں کیا
کاش کہ اس قوم کی جگہ میرے لیے ایک ایسی قوم ہوتی جو گھوڑوں اور
اونٹوں پر سوار ہو کر قتل و غارت گری کرتی!

گھوڑے اور اونٹ پر سوار ہونا، کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، مگر

جنگ و قتال کی پیٹھ پر سواری کرنا، عربوں ہی کو زیب دیتا ہے، چنانچہ ایک شاعر اپنی جراٴت رندانہ اور جذبہ محافظت احساب کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

ونرکب مکروہ احیانا فیفرجہ ۔۔۔ عنا الحفاظ واسیاف تواطینا

ہم بہت دفعہ مکروہات (جنگوں) کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہیں، اور ہمارا
جذبہ حفاظت حسب ونسب اور ہم سے موافقت کرنے والی تلواریں
ہم پر کامیابی کی راہیں کھول دیتی ہیں۔

اور پھر دوسرے لوگوں کا خون زمین پر بہتا ہے، اور ناک کے نتھنوں میں جذب ہو جاتا ہے، مگر عربوں کا خون اپنے اندر اتنی خاصیت رکھتا ہے کہ اس کی روانی کے لیے تلوار کی دھار ہی مخصوص ہے۔

تسیل علی حد الظباۃ نفوسنا ۔۔۔ ولیس علی غیر الظباۃ تسیل

ہمارا خون تلواروں کی دھار پر ہی بہتا ہے، اور اس کے سوا کسی چیز
پر نہیں بہتا

نیز ان کی جانیں زمانہ امن میں بہت گراں قدر اور قیمتی ہوتی ہیں، مگر حالت جنگ میں ارزاں ہوتی ہیں۔

انا لنرخص یوم الروع انفسنا ۔۔۔ ولو نسام بھا فی الامن اغلینا

ہم اپنی جانوں کو جنگ کے وقت ارزاں کر دیتے ہیں، اور اگر امن کے زمانہ
میں ان کو فروخت کیا جائے، تو بہت گراں ہوتی ہیں۔

دلیر اور جواں مرد انسان کا سب سے بڑا وصف یہ ہو سکتا ہے، کہ وہ

موت سے بے خطر ہو کر مبارک قتال میں کود پڑتا ہے، اور آتش جنگ سے اس کا جوہر شجاعت پہلے سے زیادہ چمک اٹھتا ہے، یہ وصف بھی بدرجۂ اتم عربوں کے اندر موجود تھا، چنانچہ ابو الغول الطہوی بنی مازن کی مدح میں رقمطراز ہے

فوارس لا یملون المنایا   اذا دارت رحی الحرب الزبون
ولا تبلی بسالتہم وان ھم   صلوا بالحرب حینا بعد حین

یہ شہسوار ہیں، کہ اسباب موت سے رنجیدہ خاطر نہیں ہوتے، جب کہ بہادروں کو موت کی گھاٹ اتارنے والی جنگ کی چکی پھرنے لگتی ہے، ان کی شجاعت مسلسل آتش جنگ میں جلتے رہنے کے باوجود تر و تازہ رہتی ہے

بدر غضب یہ ہے، کہ دوسرے لوگ لڑائی کے لیے کوئی وجہ جواز تلاش کرتے ہیں، مگر عربوں کو اس کی بھی ضرورت نہ تھی،

وانی لا ازال اخا حروب   اذا لم اجن کنت مجن جان

میں ہمیشہ جنگجوں کا بھائی (ملازم جنگ) بنا رہتا ہوں، اگر میں خود کوئی جنایت نہ کروں، تو جنایت کرنے والوں کی ڈھال ہوتا ہوں،

بہرحال عربوں کی شورش پسندی، خوالف الملوکی اور باہم قتل و خوں ریزی کی داستانیں دنیا کے لیے غیر مانوس نہیں ہیں، اور یہ بھی حقیقت ہے، کہ اسلام کا مقصد اس ہمہ گیر شورش و بدامنی کو ختم کرنا اور عالم انسانی کو امن و سلامتی کی منزل تک پہنچانا ہے، اور اس مقصد کے لیے جس لگاتار

اور مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے، اس کے لیے لفظ جنگ اور اس جیسے رسوائے عام الفاظ کا استعمال ہرگز مستحسن نہ تھا، اس لیے اسلام نے اس مقدس اور معصوم جد و جہد کے لیے جہاد کا نام تجویز کیا ہے۔

جہاد کی حقیقت شرعی اہل لغت کے نزدیک جہاد، جَہد، جُہد اور مجاہدہ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں یعنی انتہائی سعی و کوشش، شدید مشقت، انتھک محنت اور لگاتار ریاضت۔ مگر اصطلاح شرعی نے لفظ جہاد کو مخصوص معنی عطا کر دیے ہیں جس سے اب یہ عام کوشش و سعی کے معنوں سے نکل کر اس مقدس اور معصوم جد و جہد کے لیے استعمال ہونے لگا ہے جو اعلاء کلمۃ الحق اور دین قیم کی سربلندی کے لیے عمل میں آتی ہے، چنانچہ نصوص کتاب و سنت سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ لفظ جہاد کا شرعی مفہوم یہی ہے، مگر عرف عام نے اس میں اور بھی خصوصیت پیدا کر دی، اور جہاد کا اطلاق صرف قتال بالکفار پر ہونے لگا۔ اور عرف کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بہت سے اہل علم بھی اس سے متاثر ہوئے، اور انھوں نے ذیل کے الفاظ سے اس کی تعریف کر دی

بذل المجھد فی قتال الکفار (کنانی الشرع) یعنی اہل کفر سے جنگ کرنے میں انتہائی مشقت اٹھانا، مگر حقیقت یہ ہے، کہ جہاد کے مفہوم شرعی کو اس قدر تنگ کر دینا ناانصافی ہے، جب کہ کتاب و سنت نے اس لفظ کو وسیع تر معنوں میں استعمال کیا ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں منافقین

کے مقابلہ میں جہاں جہاد کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد تفہیم وتذکیر اور اتمام حجت ہے۔

یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ (توبہ)	اے نبی آپ کافروں اور منافقوں سے جہاد کریں، اور ان پر سختی کریں

اس آیت میں منافقین کے خلاف بھی جہاد کرنے کا حکم ہوا ہے، اگر اس سے مراد جہاد بالسیف نہیں ہے، بلکہ جہاد باللسان ہے۔ اور سورہ نساء کی یہ آیت اس کی تائید کرتی ہے،

اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰہُ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ وَعِظْھُمْ وَقُلْ لَّھُمْ فِیْ اَنْفُسِھِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا

بلکہ اقرب الی الفہم یہ ہے، کہ قرآن حکیم میں جہاں سیاق و سباق کسی مخصوص معنی کے حق میں نہ ہو، وہاں جہاد کا مفہوم عام ہی مراد لینا چاہیئے، مثلاً

وَجَاھِدُوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (الآیۃ)

اسی طرح احادیث صحیحہ میں جابر حکمران کے آگے کلمہ حق بلند کرنے کو اعظم جہاد کہا گیا ہے

اِنَّ مِنْ اَعْظَمِ الْجِھَادِ کَلِمَۃَ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ	سب سے بڑا جہاد ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا ہے

(اخرجہ ابوداؤد والترمذی)

اور حج مبرور کو افضل الجہاد سے تعبیر کیا ہے۔

عن عائشة انها قالت یا رسول الله نری الجهاد افضل العمل افلا نجاهد قال لکن افضل الجهاد حج مبرور (رواه البخاری)	حضرت عائشہ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا ہم جہاد کو تمام اعمال سے افضل تصور کرتے ہیں، کیا ہم بھی جہاد میں شرکت نہ کریں، فرمایا عورتوں کے لیے حج مبرور سب سے بہتر جہاد ہے۔

ان تصریحات کتاب وسنت سے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ جہاد کا لفظ صرف قتال بالکفار ہی کے لیے کوئی مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس سے وسیع تر مفہوم کا حامل ہے، اور جہاد بالسیف جس کی حقیقت کلمہ میں اسی طرح داخل ہے جس طرح دین حق کی اشاعت و سربلندی کی ہر تدبیر، مثلاً لشکر اسلامی کے لیے اسلحہ اور سامان خورد و نوش فراہم کرنا، مسلمانوں کو جہاد و قتال کے لیے تیار کرنا، اشاعت علوم دینیہ، قیام مدارس دینیہ اور ہر وہ کام جو اقامت دین کی غرض سے کیا جائے جہاد کی حقیقت میں شامل ہے۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبة)	مسلمانوں کے لیے درست نہیں ہے کہ سب کے سب جہاد و قتال کے لیے نکل کھڑے ہوں، ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر فرقہ سے کچھ لوگ اس غرض سے نکلیں کہ وہ دین میں تفقہ حاصل کریں اور جب واپس آئیں تو اپنی قوم میں تبلیغ کریں۔

ہو چکا ہے، اس منشور میں انسانوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حقوق تسلیم کیے گئے ہیں، مگر دنیا یہ سن کر دنگ رہ جائے گی، کہ ان واضعین قانون نے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے، کہ اقوام متحدہ اس منشور پر عمل کرنے کے لیے مجبور نہیں ہیں"

ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

عقل و شعور کا اقتضاء یہ ہے، کہ وضع قوانین کا مقصد وحید ان قوانین پر عمل کرنا اور انسانیت کو امن و سلامتی سے قریب تر لے جانا ہے، مگر ارباب قانون جب خود ہی یہ کہہ دیں، کہ اس قانون پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے، تو ظاہر ہے، کہ دنیا کی نگاہوں میں اس قانون کی کیا وقعت ہوگی، اور ایسے قانون بنانے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے، کہ قیام امن اور اصلاح جنگ کی کوشش آج سے نہیں، بلکہ ۱۸۶۴ء کی جینیوا کانفرنس سے شروع ہوئی، اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، اس طویل عرصہ میں بیسیوں بین الملی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہیں جن میں اسیران جنگ، زخمیوں، بیماروں، تحدید وسائل جنگ اور زہریلی گیسوں کے امتناع استعمال کے سلسلہ میں قوانین ترتیب دیے جاتے رہے، مگر دنیا یہ سمجھنے سے قاصر ہے، کہ ان علمبرداران امن عالم اور غمخواران انسانیت کا ان قوانین کے وضع کرنے سے مقصد کیا تھا؛ اگر ان کے دلوں میں خلوص و دیانت کا ایک ذرہ بھی موجود ہوتا، اور ان کی طرف سے ان قوانین کے نفاذ و اجراء کے عزم بالجزم کا اظہار ہوتا، تو آج انسانیت کی مظلومیت

دیے جائیں گی اس آخری درجہ تک نہ پہنچ چکی ہوتی اور خود ان ہی کی خواہان انسانیت کے ہاتھوں ہاتھوں لب تیمار دار نہ ہو چکی ہوتی۔ ؎

درد است طبیب است علاج ہم درد شدہ
دردے کہ طبیبم دہد آں را چہ علاج

مگر بات یہ ہے کہ قیام امن کا شور دنیا کو فریب دینے کے لیے ہے، ورنہ اس کی تہہ میں کوئی اور ہی جذبہ کارفرما ہے۔ ؎

اے دل طریق رندی از محتسب بیاموز
مست است و در حق او کس ایں گماں ندارد

اس بات سے انکار کرنا ایک تاریخی حقیقت کا انکار ہے کہ پوری تاریخ حرب میں کسی ایسی جنگ کا سراغ لگانا بہت مشکل ہے جو محض انسانیت عامہ کے بلند تر اور بہترین مقصد امن کے لیے لڑی گئی ہو اور اس میں احترام انسانیت اور اخلاقی مقتضیات کو ملحوظ رکھا گیا ہو، مگر مذہب اسلامی کے متعلق بلا خوف و خطر یہ اعلان کیا جا سکتا ہے کہ اس میں یہ دونوں امتیازی صفات بطریق اتم موجود ہیں۔

پہلی امتیازی صفت مذہب اسلامی کا مقصد محض انسانیت عامہ کی فلاح اور ہمہ گیر امن کا قیام ہے۔ گذشتہ مباحث میں اس پر مفصل بحث کی جا چکی ہے اور آئندہ صفحات میں اس کی دوسری صفت یعنی جہاد اسلامی مکمل طور پر ایک آئینی اور اصولی جنگ ہے جسے اسلام کے مقدس ضابطۂ اخلاق کے ماتحت لڑی جاتی ہے

کو زیر بحث لایا جائے،

جہادِ اسلامی کی اخلاقی قدریں

اقوامِ دنیا کے نزدیک، جنگ اور قانون دو متضاد چیزیں ہیں اور ان کا خیال یہ ہے، کہ جنگ اخلاق دشمنی قانون شکنی اور بے اصولی کا دوسرا نام ہے، اس لیے جنگ کو قانون کے تحت لانا ان کے نزدیک سراسر حماقت ہے چنانچہ پروفیسر ہولنڈ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے، کہ جنگ بین الملکی قانون کے نقطہ نظر سے ہمیشہ قانون کی ضد تصور کی جاتی رہی ہے، مگر جہاد اسلامی کسی حال میں قانونی حد بندی سے باہر نہیں ہے، بلکہ سراپا اسلامی قانون جنگ کے تابع ہے، اور اسلام کا قانون جنگ ان ہمہ گیر اخلاقی قدروں پر مبنی ہے، جن کا تعلق احترام آدمیت کے مقدس اور بے لوث جذبہ اور ما بعد الطبیعی تصورات سے ہے، چنانچہ جہاد کی اسلامی قدریں یہ ہیں:۔

(۱) خلوص مقصد (۲) احترام انسانیت (۳) احتراز عن الفساد (۴) صداقت (۵) دیانت

یہ پانچ امور ہیں جو اسلامی آئین جنگ کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس مبحث میں ہم انہی امور کی روشنی میں اسلامی ضابطہ جنگ سے بحث کریں گے مگر اس سے پہلے ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

آج پرستاران تجدد کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے، کہ مشہور

کی قدریں ہر زمانہ میں بدلتی رہتی ہیں، کیونکہ جب زمانہ کی رفتار ترقی کسی کے روکنے سے نہیں رک سکتی، اور علم انسانی کے مسائل حیات ہر دور میں یکساں نہیں رہتے، بلکہ ہر لحظہ نظامات اور زندگی کے مقتضیات میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو رہی ہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اشیاء کی قدریں جوں کی توں باقی رہیں، اور حالات کے جدید تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہو،

آج اس سوال کو جس قدر اہمیت دی جا رہی ہے، اسی قدر یہ سوال سطحی بلکہ سراسر لغو ہے، حقیقت یہ ہے، کہ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے، کہ زندگی کے بہت سے مسائل ہر زمانے میں بدلتے رہتے ہیں، اور حالات زمانہ ہر لحظہ دو متغیر ہیں، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے، کہ زمانہ کی ہر چیز بدلنے کے لیے ہے، اور دنیا میں کسی ایسی چیز کا وجود ہی نہیں جو لازم انسانیت کی حیثیت سے اٹل اور غیر متبدل ہو، یہ صحیح ہے، کہ جو چیزیں بدلنے والی ہیں، ان کے بدلتے رہنے ہی میں نوع انسانی کی بھلائی ہے، مگر اس عالم میں کچھ ایسے حقائق بھی ہیں جن کا تعلق دو متغیر حالات کو الف اور متبدل مقتضیات سے نہیں ہے، بلکہ وہ ازلی اور ابدی ہیں، اور ان کا تعلق نفس انسانیت سے ہے، یعنی وہ ہر دور میں اٹل غیر متزلزل اور لاتغیر ہیں، یہ وہ عالمگیر صداقتیں اور عالمی نظریئے ہیں، جن پر ماحول کی تبدیلی اثر انداز نہیں ہوتی اور نوع انسانی کی نجات اسی میں ہے کہ ان کو ان کی اصلی حالت پر ہی رہنے دیا جائے، ہم ان لوگوں سے

انسانیت کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں، کہ کیا عالمگیر امن اور فلاح
انسانیت کے لیے آج بھی ان متذکرہ امور کی اسی طرح ضرورت نہیں ہے
جس طرح آج سے پہلے تھی، یا آئندہ کسی زمانہ میں ان کی ضرورت واہمیت
سے اغماض کیا جا سکتا ہے؟

خلوص مقصد

جنگ کا اصلی محرک اگر کوئی اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی
نصب العین نہ ہو، بلکہ محض مادی خواہشات کی تسکین
ہو، تو اس صورت میں انسان کی نظر میں ہر وہ چیز مستحسن اور دلفریب ہوگی
جو اس کو اس حیوانی مقصد کے حصول میں مدد دے سکتی ہو، اور جو چیز ایسی نہیں
ہوگی، وہ اس کے نزدیک قابل نفرت ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے، کہ اقوام دنیا کی تاریخ حرب کا سب
سے بڑا داعیہ معیشت کا مسئلہ ہے، اس کے علاوہ دوسرے داعیات بھی
ہیں، لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہے، یعنی ملکی جنگ ہو یا قومی اور نسلی اس کے
محرکات وداعیات کا سلسلہ بالآخر معاشی سوال پر ہی منتہی ہوتا ہے۔

یہ تو عام جنگوں کی حالت تھی، لیکن عرب قبل الاسلام کی جنگوں میں
معاشی ضرورت کا پہلو بہت زیادہ نمایاں تھا، چنانچہ مقالہ کے ابتدائی حصہ
میں لکھا جا چکا ہے، کہ زمین عرب کی پیداوار اس کے باشندوں
کے لیے بالکل ناکافی تھی، اور ان دلیر اور تنومند انسانوں کے لیے اس کے
سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، کہ وہ اپنے وطن سے نکل کر دوسرے ممالک کے
ذرائع پیداوار سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ تمام عرب اقوام نے اس مقصد

کے پیش نظر دنیا کے بیشتر ممالک پر یلغار کی، اور سخت خوں ریزی اور سفاکی کے بعد ان ممالک کے باشندوں کو مغلوب کیا، اور وہاں عظیم الشان مملکتیں قائم کیں، اور جو لوگ عرب ہی میں رہ گئے تھے، ان میں ہمیشہ قبائلی جنگیں جاری رہتی تھیں، یہاں تک کہ ان کی شدید معاشی ضرورت اور جنگ جویانہ طبیعت کے لیے تین مہینوں (اشہر حرم) کی پابندی بھی ناگوار تھی، چنانچہ ابو علی قالی نے لکھا ہے،

وذلك انهم كانوا يكرهون ان تتوالى	وہ اس بات کو نا پسند کرتے تھے کہ مسلسل
عليهم ثلاثة اشهر لا تمكنهم الاغارة	تین ماہ ان کے لیے لوٹ مار ممکن نہ ہو
فيها لان معاشهم كان من الاغارة	کیوں کہ ان کی معاش کا ذریعہ ہی
(کتاب الامالی جلد اول)	لوٹ مار تھا،

اس مقصد کے لیے وہ اشہر حرم کو حسب ضرورت دوسرے مہینوں سے بدل دیا کرتے تھے، اور اس رسم کے لیے انہوں نے نسیء کی اصطلاح ایجاد کی تھی،

ظاہر ہے کہ جو لوگ محض معاشی، وطنی اور قومی مفاد کے لیے لڑتے ہیں، ان کے نزدیک یہی مفاد تمام دوسرے امور سے برتر ہوتا ہے، اور وہ تمام ذرائع جن سے ان مفاد کو حاصل کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز ان کے اختیار میں ان کو ہرگز تامل نہیں ہوتا، کیونکہ ان کے سامنے کوئی معصوم اخلاقی مقصد قطعاً نہیں ہوتا جو ان کو افراط و تفریط سے باز رکھ سکے،

جواب دیا کہ جو شخص اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ   (بخاری)   سبیل اللہ

کا کلمہ بلند ہو، صرف وہی اللہ کے راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام انسانوں کو جس بلند تر مقام پر دیکھنا چاہتا ہے عصر حاضر کا انسان جو عالم رنگ و بو میں کھو چکا ہے، اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا، اور یہ بات اس کے ماؤف دماغ میں سما ہی نہیں سکتی، کہ ایک غیر مادی اور غیر محسوس نصب العین کے لیے، دنیا کے تمام علائق اور جسم کی تمام راحتوں کو قربان کر دیا جائے، نہ سرمایہ و دولت کی خواہش ہو اور نہ ریاست و حکومت کی ہوس، بلکہ جسم کی کوئی چاہت اس کے دامن گیر نہ ہو، اور محض رب العالمین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دے، اس وسیع و عریض کرۂ ارض میں انسانیت کا یہ مقام رفیع صرف مردِ مومن ہی کو حاصل ہے، اور دنیا کا کوئی انسان اس وصف میں اس کا شریک و سہیم نہیں ہے، ؎

مومنے بالائے ہر بالا ترے   غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

جہاد میں شرکت کرنے والوں کے لیے اموالِ غنائم قرآنی طریق تقسیم کے ماتحت، حلال اور طیب قرار دیئے گئے ہیں مگر کوئی شخص غنیمت ہی کو مقصود بنا لے، تو اس کی تمام محنت و جانفشانی اکارت جاتی ہے اور وہ جہاد کے اجر و ثواب سے محروم کر دیا جاتا ہے، بلکہ اگر اصل مقصد جہاد کے ساتھ حصولِ مال یا حصولِ اقتدار کی معمولی سی خواہش بھی شامل ہو، تو خدا کے نزدیک ایسا جہاد بھی جہاد فی سبیل اللہ متصور نہیں ہوتا، چنانچہ سنن

ابوداؤد میں ہے، کہ:-

رجل یرید الجهاد فی سبیل الله وهو یبتغی عرضا من عرض الدنیا فقال النبی صلعم لا اجر له

ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ ایک آدمی سراسر اللہ ہی کی راہ میں جہاد کرتا ہے، مگر اس کے دل میں دنیاوی متاع کی بھی خواہش ہے! فرمایا کہ اس کے لیے اللہ کے ہاں کوئی اجر نہیں ہے،

عام مسلمانوں نے جب یہ سنا، تو انھوں نے اس کو بہت بڑی بات تصور کیا، اور دوبارہ سہ بارہ حضور سے پوچھا گیا، مگر آپ نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا "لا اجر له"

ایک دفعہ حضور صلعم نے فرمایا، کہ پورا ثواب اسی کو ملتا ہے، جو غنیمت کو ہاتھ بھی نہ لگائے، ورنہ دو تہائی ثواب کم ہو جاتا ہے،

ما من غازیة تغزوا فی سبیل الله فیصیبون الغنیمة الا تعجلوا ثلثی اجرهم من الآخرة ویبقی لهم الثلث وان لم یصیبوا غنیمة تم لهم اجرهم (مسلم وابوداؤد)

جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، اور پھر مال غنیمت حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے ثواب کی دو تہائی دنیا ہی میں پا لیتے ہیں اور آخرت کے لیے صرف ایک تہائی باقی رہ جاتی ہے اور جو لوگ غنیمت نہیں لیتے ان کو پورا اجر ملتا ہے،

خلاصہ یہ کہ جنگ سے جن لوگوں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے، کہ قیام امن اور ارتقائے حریت انسانی کی راہ میں جتنی رکاوٹیں حائل ہیں، ان کو ہٹایا جائے، اور جو اپنے مقصد میں اس حد تک دیانت دار اور مخلص ہیں کہ اپنا

سب کچھ اس کے لیے قربان کر دیتے ہیں، مگر کسی دنیوی فائدہ کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے سنا نخانہ دل میں جگہ نہیں دیتے، کیا ان لوگوں سے اس بات کا کوئی خطرہ ہو سکتا ہے، کہ وہ ایسے اخلاق سوز اور ضد انسانیت اعمال کا ارتکاب کریں گے جو ان کو اپنے محبوب ترین نصب العین سے دور لے جانے والے ہوں؟ کوئی عقلمند انسان اس بات کو ایک لمحہ کے لیے بھی باور نہیں کرے گا، کہ انسانوں کی جو جماعت فسق و معصیت، شورش و بدامنی اور فتنہ و فساد کو ختم کرنے کے لیے اٹھی ہے اور اس کے سوا اس کی زندگی کا کوئی اور مقصد ہی نہیں ہے، وہ خود ہی قتل و غارتگری اور غصب و نہب ایسے شرمناک افعال کا ارتکاب کرے گی جو فساد انسانیت پر منتج ہوتے ہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ مرد مومن اس تجارت میں حلال اور طیب منافع سے بھی گریز کرتا ہے، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا پاکیزہ جذبہ قربانی و ایثار نفسانیت کی نجاست سے ملوث ہو جائے ؎

دل ہلاوم و جان دادم و ایمان دادم سودا است دلے سود نمی اندیشیت

احترام انسانیت

جنگ فی ذاتہ بری چیز ہے لیکن اسلام نے اس کو ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے مشروع قرار دیا ہے، مگر اس کی مشروعیت ضرورت کی حد تک محدود ہے۔ یعنی جنگ سے اسلام کا مقصد استیصال فتنہ، قیام امن اور کلمۂ حق کی سربلندی ہے، اور جب تک یہ داعیہ موجود ہے، اس وقت تک اسلام اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے، کہ وہ جنگ دشمنان جاری رکھیں، مگر اس مقصد

کے حصول کے بعد مسلمان اس اہم فریضۂ زندگی سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، اور اس کے بعد بے ضرورت قتل و خونریزی قطعاً جائز نہیں ہے۔

نیز میدان جنگ میں بھی اسی حد تک قتل و خون ریزی جائز ہے جس سے اصل مقصد کے حصول میں مدد مل سکتی ہو، مگر ضرورت سے زیادہ خواہ مخواہ انسان کا خون بہانا اسلام کے نزدیک سخت ممنوع ہے کیونکہ اسلام میں انسانی خون بہر حال مستحق احترام ہے یہی وجہ ہے کہ رسالت مآب صلعم جنگ کو پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ ہمیشہ امن کے خواہش مند رہتے تھے،

ایہا الناس لا تتمنوا لقاء العدو	اے لوگو، جنگ کی خواہش نہ کرو، اور خدا سے
واسئلوا الله العافیۃ فاذا لقیتموہم	امن کے طلبگار رہو، لیکن تمہیں جنگ کرنا ہی
فاصبروا واعلموا ان الجنۃ تحت	پڑے تو صبر کرو اور ثابت قدم رہو، اور یقین
ظلال السیوف (مسلم)	رکھو کہ جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے

امام نووی نے اسی حدیث کے ضمن میں لکھا ہے:۔

وقد کثرت الاحادیث فی الامر	خداوند کریم سے امن طلب کرنے کے بارے
بسوال العافیۃ	میں بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں،

غرض انسانی خون کا احترام اسلام کی بنیادی اصل ہے، اور اسی کی بنا پر اثنار جنگ میں بوڑھوں، عورتوں، بچوں، اسیروں، زخمیوں اور غیر محارب افراد و جماعات کا قتل ممنوع قرار دیا گیا ہے

اسلام سے پہلے اقوام دنیا بالعموم اور اہل عرب بالخصوص جنگ میں کسی اخلاقی ضابطہ کی رعایت نہ کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ

میں کبھی قانون جنگ کا وجود ہی نہ تھا، چنانچہ اہل عرب جنگ کے دوران میں انتہائی شرمناک افعال کا ارتکاب کرتے تھے۔ مثلاً عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو قتل کرنا، زندوں کو آگ میں جلانا، ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضا کاٹ کر چھوڑ دینا کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے، قتل کے بعد بھی مردوں کے ہاتھ پاؤں، ناک، کان کاٹ دینا، حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر دینا، رات کو غفلت کی حالت میں حملہ آور ہونا، اور دشمن کو قتل کرنے کے بعد اس کی کھوپڑی میں شراب پینا،

یہ وحشیانہ اور بہیمانہ حرکات اس زمانہ کی یادگار ہیں، جب کہ ظلم زندوں کے نام سے دنیا ناآشنا تھی، مگر آج بھی ایسی ذلیل اور وحشی قومیں اس کرۂ عظیم میں بس رہی ہیں جو اس سے ہزار درجہ زیادہ وحشت و بربریت کا مظاہرہ کر رہی ہیں، اور آج انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے، کہ ان وحشی اور ذلیل قوموں سے خدا کی زمین کو پاک کیا جائے

غرض اسی قسم کے ظالمانہ افعال چونکہ انسانیت کی توہین کا باعث ہیں، اس لیے اسلام نے ان کی سختی سے ممانعت کر دی ہے،

ان رسول اللہ صلعم کان اذا بعث سریۃ لیقول لہم اغزوا بسم اللہ فی سبیل اللہ تقاتلون من کفر باللہ لا تغلوا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدًا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی جماعت کو جنگ کے لیے بھیجتے تو اس سے مخاطب ہو کر فرماتے، تم اللہ کے نام سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، ان لوگوں سے لڑو جو اللہ کا انکار کرنے

ولا امرأة (رواہ مالک)	والے ہیں، اموال غنیمت میں چوری نہ کرو،

حملہ نہ کرو، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرو،

لا تعذبوا الناس فان الذين	انسانوں کو عذاب نہ دو، کیونکہ جو لوگ انسانوں
يعذبون الناس يعذبهم الله	کو عذاب دیں گے، اللہ تعالیٰ ان کو قیامت
يوم القيامة (کتاب الخراج)	میں ہمیشہ عذاب کرے گا،
ان الله يعذب الذين يعذبون	جو لوگ دنیا میں انسانوں کو دکھ اور اذیت دیتے
الناس في الدنيا (ابوداؤد)	ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اذیت دے گا،
لا ينبغي ان يعذب بالنار الا	آگ کا عذاب دینا صرف خدا ہی کا حق
صاحب النار (حدیث)	ہے،

اسی طرح زخمیوں اور اسیروں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے،

ولا يجهزن على جريح ولا يتبعن	زخمی پر حملہ نہ کیا جائے، بھاگنے والے
مدبرا ولا يقتلن اسيرا	کا پیچھا نہ کیا جائے، اور قیدی کو
(فتوح البلدان)	قتل نہ کیا جائے،

موجودہ قوانین دول میں بھی مذکورہ بالا دفعات کو شامل کیا گیا ہے چنانچہ
سب سے پہلے ۱۶۲۳ء میں اقوام مغرب نے ہالینڈ کے مقنن گروشیوس کی
ان سفارشات کو قبول کیا، کہ جنگ میں بچوں، عورتوں، بوڑھوں، مذہبی پیشواؤں
زخمیوں اور اسیران جنگ کو قتل نہ کیا جائے، اور اس کے بعد تدریجاً بین
الملی قوانین میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، اور کئی دوسرے امور کو بھی قانونی
حیثیت دے دی گئی، مثلاً اسلحہ سازی کے کام کو محدود کر دیا جائے،

زہریلی گیس نہ استعمال کی جائیں، جنگ کے دوران میں دشمن کے تجارتی جہازوں کو نہ چھینا جائے، مریضوں، زخمیوں اور معالجوں کو قتل نہ کیا جائے، کھانے پینے کی چیزوں میں زہر نہ ملایا جائے، شفاخانوں اور عبادت گاہوں پر بمباری نہ کی جائے، نیز زخمیوں کو محفوظ مقامات میں لے جانے والے نوجیوں سے تعرض نہ کیا جائے، اور غیر محارب لوگوں کو قتل نہ کیا جائے

غرض اقوام حاضرہ نے سترھویں صدی میں ان بنیادی حقوق انسانیت کی طرف توجہ کی، مگر اسلام نے اس سے بہت پہلے جنگ کا مکمل قانون پیش کر دیا تھا جس کی ایک ایک شق میں احترام انسانیت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے، اور پھر اسلامی قانون جنگ اور اقوام حاضرہ کے قانون جنگ میں فرق یہ ہے، کہ قانون دول کی پشت پر کوئی ایسی طاقت نہیں ہے، جو اس کے اجرار و نفاذ کی ضامن ہو، چنانچہ ان قوانین کی ترتیب و تدوین کے بعد بھی وہی کچھ ہوتا رہا ہے، جو اس سے پہلے ہوتا رہا، اور آج تک اقوام عالم کا بین المللی قانون (انٹرنیشنل لا) فریب و ریاکاری سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اس بنا پر اس کو قانون کہنا ہی غلط ہے، چنانچہ لارڈ سالسبری نے سچ کہا ہے کہ اس کو کوئی عدالت قوت سے نافذ نہیں کر سکتی، اس بنا پر اس کو لفظ قانون سے تعبیر کرنا سخت غلطی ہے، مگر اسلامی قانون جنگ پر عمل کرنا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے، اور ان کی قوت ایمانی اس کے نفاذ و اجرار کی ضامن ہے چنانچہ تاریخ اسلامی شاہد ہے، کہ عہد رسالت اور زمانہ خلافت راشدہ میں مسلمانوں نے اس قانون کی ایک ایک شق پر عمل کیا، اور دنیا جانتی ہے، کہ

اتنی شدید پابندیوں کے باوجود مسلمانوں نے چند ہی سالوں میں کئی لاکھ مربع میل خطہ ارضی کو زیرنگیں کیا، اور حقیقت یہ ہے، کہ ان کی فتوحات کی اصل وجہ یہی تھی، کہ ان کے دلوں میں احترام انسانیت کا بے پناہ جذبہ موجزن تھا، اور یہ لوگ جہاں جاتے تھے، وہاں کے باشندے ان کے اعلیٰ اخلاق اور بلند سیرت کو دیکھ کر ان کو اپنے نجات دہندہ تصور کرتے تھے، بلکہ وہ اپنوں سے کٹ کر مسلمانوں سے آملتے تھے۔

ہمہ زخویش بریدند و با تو پیوستند ۔۔۔ تو نخل خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن ا

احتراز عن الفساد بغیر کسی اعلیٰ مقصد کے قتل وخون ریزی کرنا، ضروریات زندگی کا اتلاف وضیاع اور فسق ومعصیت کے تمام اقسام فساد میں داخل ہیں، چنانچہ اہل علم نے فساد کی تعریف ہی یہ کی ہے اَلْعَمَلُ بِالْمَعْصِیَۃِ یعنی معصیت ونافرمانی کا ہر کام فساد ہے، اور قرآن حکیم نے ان تمام انواع فساد کو ممنوع قرار دیا ہے، چنانچہ ذیل کی آیت میں نسل کشی اور اتلاف ضروریات زندگی کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے،

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (البقرۃ)

جب وہ لوٹتا ہے تو زمین میں اس غرض سے دوڑتا پھرتا ہے، کہ کھیتی اور انسانی نسل کو تباہ کرے، اور اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند کرتا ہے،

اسی طرح ریاکاری اور اقتدار کی جنگ بھی فساد کے مفہوم میں داخل ہے

یہی وجہ ہے، کہ اسلام جس طرح زمانہ امن میں احترام عہد اور صداقت شعاری کو ضروری قرار دیتا ہے، اسی طرح حالت جنگ میں بھی مسلمانوں کے لیے اس کی پابندی لازمی ہے، چنانچہ قرآن حکیم نے بار بار پابندی عہد کی تاکید کی ہے، یہاں تک کہ اپنی مظلوم اسلامی برادری کی امداد و اعانت کے مقابلہ میں بھی احترام عہد کو ترجیح دی ہے۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۔
(الانفال)

اگر وہ (غیر مسلمان) دین کے مقابلہ میں تم سے مدد چاہیں، تو تم پر ان کی مدد کرنا ضروری ہے، مگر ایسی قوم کے خلاف مدد کرنا جائز نہیں ہے جس سے تمہارا معاہدہ ہے۔

ہاں اگر آثار و قرائن سے یہ معلوم ہو جائے، کہ معاہد قوم اپنے عہد کی پابند نہیں رہے گی، اور وہ مسلمانوں کے خلاف جارحانہ اقدام کرے گی، تو ایسی حالت میں اسلام نے اجازت دی ہے، کہ اس کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کیا جائے، اور اس کو غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا جائے، کہ اب ہم معاہدہ کے پابند نہیں ہیں۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ
(الانفال)

اگر تم کو کسی قوم کی طرف سے بدعہدی کا خوف ہو، تو عدل کے طریق پر تم اس کو اختتام عہد سے باخبر کر دو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اگر معاہد قوم کی طرف سے عہد شکنی کا ارتکاب ہو چکا ہو، تو پھر اعلام و اظہار کی بھی ضرورت نہیں ہے اور اعلان جنگ کے

امام نووی نے تصریح کی ہے،

واتفق العلماء علی جواز خداع الکفار فی الحرب کیف امکن الا ان یکون فیہ نقض عہد او امان فلا یحل (شرح مسلم)

حالت جنگ میں خداع کے جواز پر علماء کا اتفاق ہے، مگر اس صورت میں جب کہ اس سے نقض عہد یا نقض امان لازم آتا ہو، کہ یہ ہرگز جائز نہیں ہے،

احکامِ دیانت

حالت جنگ میں غصب و نہب کی نوبت اسی وقت آتی ہے، جب کہ اہل فوج کے سامنے اپنا مفاد ہوتا ہے اور وہ اس غرض سے غصب اور لوٹ مار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، کہ ان کو اس بات کا یقین ہوتا ہے، کہ ہم جو کچھ لوٹیں گے، وہ اپنے ہی تصرف میں لائینگے لیکن اسلام نے غصب اور لوٹ مار کی ممانعت میں اتنے سخت احکام دیے ہیں، کہ ان کی موجودگی میں کوئی سچا مسلمان ان قبیح حرکات کے ارتکاب کی جرأت ہی نہیں کر سکتا،

ابوداؤد میں ایک انصاری کی روایت ہے، کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے، اور سخت تنگ دستی اور فاقہ کی نوبت آئی، اتفاقاً بکریوں کا ایک ریوڑ سامنے نظر پڑا، تو ہم لوگ اس پر ٹوٹ پڑے، بکریوں کو ذبح کیا، اور گوشت پکانا شروع کر دیا، جب آنحضرت صلعم تشریف لائے، تو آپ نے تمام ہانڈیاں الٹ دیں اور فرمایا۔

ان النہبۃ لیست باحل من المیتۃ۔ لوٹ مار کا مال مردہ سے زیادہ حلال نہیں

جب مدائن فتح ہوا، تو بیش بہا جواہرات اور قیمتی ساز و سامان ہاتھ لگا، مگر

حیرت کی بات یہ ہے کہ جس سپاہی کو جو چیز ملی، اس نے بجنسہٖ اپنے افسر کے
پاس حاضر کر دی۔ اس پر سعد بن ابی وقاصؓ بار بار حیرت کا اظہار کرتے تھے، کہ
ان لوگوں نے ایسے نادرات کو چھوا تک نہیں، بے شبہ یہ لوگ غضب کے ایماندار
ہیں۔ جب پانچواں حصہ مدینہ منورہ میں پہنچا تو حضرت عمرؓ کو بھی مسلمانوں کی دیانت
اور بے نیازی پر حیرانی ہوئی۔

اسلام نے اموالِ غنائم کے لیے ایک ضابطہ بنا دیا ہے اور ان اموال
کی تقسیم اس ضابطے کے تحت عمل میں آتی ہے یعنی غنیمت کے پانچ حصے کیے
جاتے ہیں، ایک حصہ بیت المال کے لیے اور باقی چار حصے غازیوں میں تقسیم
کیے جاتے ہیں مگر کسی غازی کو اس کی ہرگز اجازت نہیں کہ سوئی کے برابر
بھی کوئی چیز از خود اپنے مصرف میں لائے۔ مالِ غنیمت کی چوری کا نام "غلول"
رکھا گیا ہے، اور کتاب و سنت میں غلول کے متعلق سخت احکام وارد ہوئے ہیں
مگر بات یہ ہے کہ جو لوگ اموالِ غنیمت سے جائز حصہ بھی اس لیے لینا
پسند نہیں کرتے کہ اس سے اخروی اجر و ثواب میں کمی آتی ہے، ان سے
یہ توقع کب ہو سکتی ہے کہ وہ ناجائز طریق سے کوئی چیز حاصل کرنے کی کوشش
کریں گے۔

یہ عجیب بات ہے کہ گزشتہ ایامِ انقلاب میں ہندوؤں کا مال جس
بیدردی سے لوٹا گیا، اس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مگر اس لوٹ کو
غنیمت کا نام دیا گیا، حالانکہ ہندوؤں کے متروکہ اموال غنیمت کی تعریف میں ہرگز
نہیں آتے، اور اگر ان کو غنیمت ہی تصور کر لیا جائے تو اموالِ غنیمت کے حصول

عن اسلم ابی عمران قال غزونا من
المدینة نرید قسطنطنیة وعلی
الجماعة عبد الرحمن بن خالد بن
الولید والروم ملصقو ظهورهم
بحائط المدینة فحمل رجل علی
العدو فقال الناس مه مه لا اله
الا الله یلقی بیدیه الی التهلکة
فقال ابو ایوب الانصاری انما نزلت
هذه الآیة فینا یا معشر الانصار
لما نصر الله نبیه واظهر الاسلام
قلنا نقیم فی اموالنا ونصلحها
فانزل الله تعالی هذه الآیة
فالالقاء بایدینا الی التهلکة
ان نقیم فی اموالنا ونصلحها و
ندع الجهاد

(اخرجہ ابو داؤد النسائی وصححہ ابن حبان)

ہم مدینہ سے جہاد کی غرض سے نکلے اور ہمارا
ارادہ قسطنطنیہ تھا، امیر العسکر عبد الرحمن بن
خالد تھے، روم مقابلہ کے لیے بالکل تیار
کھڑے تھے کہ ایک مسلمان نے دشمن پر
حملہ کیا، لوگوں نے کہا ہاں ہاں یہ شخص اپنے
آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے، ابو ایوب
انصاری نے فرمایا اے گروہ انصار یہ
آیت ہماری شان میں نازل ہوئی ہے
جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی مدد کی، اور
اسلام کو غالب کیا تو ہم نے دل میں ارادہ کیا
کہ آؤ اب ہم اپنے اموال میں قیام کریں
اور ان کی اصلاح کریں اس پر قرآن کریم
کی یہ آیت نازل ہوئی پس اپنے ہاتھوں
اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا یہ ہے کہ ہم
اپنے اموال میں قیام کریں، ان کی اصلاح
میں مشغول ہو جائیں، اور جہاد کو چھوڑ دیں

اس بات کا سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، کہ قرآن نے ترک جہاد کو
ہلاکت کیوں قرار دیا ہے اور اصل اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خدائے
قدوس نے اس امت کو ایک بلند تر مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اس مقصد

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (الآیۃ)

اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے، جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی دیوار کی طرح صف باندھ کر لڑتے ہیں،

ایسا کیوں نہ ہو؟ کہ جب انسانیت دنیا کے جفاکار انسانوں کے ہاتھوں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہی ہوتی ہے، اور خدا کی زمین اس کی مخلوق کے لیے جہنم زار بن جاتی ہے، اور ہر طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، تو مرد مجاہد کی تلوار بے نیام ہو کر دنیا سے جور و ظلم، فسق و معصیت، اور تمام مفاسد کا خاتمہ کرتی ہے، اور دنیا کی مظلوم اور ستم زدہ آبادی کو اہل ظلم کے پنجۂ استبداد سے رہائی دلاتی ہے، اور اسی مرد خدا کی زبان حقیقت آشنا اسرار قدرت کی نقاب کشائی کرتی ہے، اور اس کی ایمانی شعاعوں سے ظلمت کدۂ عالم بقعۂ نور بن جاتا ہے ؎

ذات او توجیہ ذات عالم است — از جلال او نجات عالم است

اور اس کا فقر عریاں سلاطین عالم کے سربفلک ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیتا ہے ؎

با سلاطین در فتد مرد فقیر — از شکوہ بوریا لرزد سریر!

ملت اسلامیہ کی تخلیق کا مقصد

ملت اسلامیہ کی غایت وجود اعلائے قیام خلافت الٰہیہ اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے ایک مسلسل جد و جہد کرتا ہے، اور اس جد و جہد کا اولین نتیجہ یہ ہے کہ انسانی آبادی غیر اللہ کی حاکمیت سے رہائی پاتی ہے اور احکم الحاکمین

فرائض اسلامی میں جہاد کا مرتبہ

مباحث ماسبق سے یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ جہاد ہی وہ عظیم الشان فریضہ ملی ہے جو نہ صرف نظام ملت کے قیام و بقا کے لیے بلکہ فلاح انسانیت کے لیے از بس ضروری ہے، اور اسی بنا پر اسلام میں جہاد کو جو عظیم الشان مرتبہ حاصل ہے، وہ دوسرے عمل کو حاصل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اسی عمل کو مسلمانوں کے لیے ذریعہ نجات قرار دیا ہے،

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصَّابِرِيْنَ (آل عمران)	کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو تمیز نہیں کیا
اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (العنکبوت)	کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انکو صرف آمنا کہنے سے رہائی مل جائے گی اور انکو آزمائیوں میں نہیں ڈالا جائے گا
اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَ الضَّرَّاۗءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ	کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم بہشت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابتک تم کو وہ حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آئی تھی، انکو سخت دکھ اور تکلیف پہنچی کہ وہ کانپ اٹھے

وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ (البقرة)

یہاں تک کہ رسول اور ایمان والے اس کے ساتھ کہہ اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ رہو کہ خدا کی مدد بہت قریب ہے۔

بلکہ خدا اور رسول کی نظر میں جہاد ہی ایمان اور نفاق میں مابہ الامتیاز کا درجہ رکھتا ہے۔

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ (التوبة)

آپ سے گھر میں بیٹھنے کی اجازت وہ لوگ ہی مانگتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہیں۔

من مات ولم یغز ولم یحدث به نفسه مات علی شعبة من النفاق (رواہ مسلم وابو داؤد)

جو شخص مر جاتا ہے اور اس نے کبھی جہاد نہیں کیا، اور نہ ہی کبھی اس کا ارادہ کیا ہے، وہ گویا منافق ہو کر مرا ہے۔

احادیث نبویہ سے ظاہر ہے کہ جہاد ہی وہ مقدس عمل ہے، کہ کوئی دوسرا عمل اس کا بدل نہیں ہے۔

عن ابی هریرة قال جاء رجل الی النبی صلعم فقال دلنی علی عمل یعدل الجهاد قال لا اجده قال هل تستطیع اذا خرج المجاهد ان تدخل مسجدك فتقوم ولا تفتر وتصوم ولا تفطر قال

ایک شخص نبی کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ آپ کوئی ایسا عمل بتائیں جو اجر و ثواب میں جہاد کا مقابلہ کرتا ہو۔ فرمایا ایسا کوئی عمل نہیں ہے۔ فرمایا کہ کیا تم اس کی طاقت رکھتے ہو کہ جب مجاہد جہاد کے لیے نکلے اور تم مسجد میں جا کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ، اور مسلسل

ومن یستطیع ذالک (بخاری) سکون نہ کرو، اور اس طرح روزہ رکھو کہ بالکل افطار نہ کرو، کہا کہ اس کی کون طاقت رکھتا ہے؟

عن انسؓ لغدوۃ فی سبیل اللّٰہ او روحۃ خیر من الدنیا وما فیہا (بخاری) اللہ کی راہ میں صبح کرنا یا شام کرنا دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے۔

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلعم قال والذی نفسی بیدہ لوددت ان اقاتل فی سبیل اللہ فاقتل ثم احیی فاقتل ثم احیی فاقتل (موطا امام مالک) رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کی ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر مارا جاؤں۔

خدا اور رسول کی نظر میں جہاد کی اس مقبولیت کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دوسرے اعمال خیر کی حیثیت محض انفرادی ہے اور جماعت یا انسانیت عامہ سے اگر ان کا تعلق ہے، تو اولاً وہ بالذات نہیں ہے اور اجتماعی اعمال میں جہاد کے سوا کوئی ایسا عمل نہیں ہے، جو براہ راست نظام ملت اور انسانی فلاح کا ضامن ہو،

نیز باقی تمام اعمال صالحہ ملت کی حریت اور نظام ملت کے بقا کے سوا ممکن العمل نہیں ہیں اور جہاد کے ذریعہ نظام ملت کی حفاظت کی جاتی ہے اس لیے تمام اعمال خیر کے لیے یہ موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے، البتہ کچھ ایسے اعمال بھی ہیں، جو جہاد کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً التزام جماعت، سمع وطاعت، اور ہجرت اس لیے کتاب وسنت نے ان اعمال کی

بھی باتیں ہی بتا یکھی کی ہے،

قال رسول اللہ صلعم وانا امرکم بخمس اللہ امرنی بھن الجماعۃ و السمع والطاعۃ والھجرۃ والجہاد فی سبیل اللہ فانہ من خرج من الجماعۃ قیس شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع (رواہ احمد)	رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں تم کو پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے، التزام جماعت، سمع اطاعت ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کیونکہ جو شخص ایک بالشت بھی جماعت سے نکل گیا گویا اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے اتار دی، مگر اس صورت میں جب کہ وہ پھر جماعت میں لوٹ آئے،

جہاد کا دائرۂ وجوب

کسی گذشتہ باب میں یہ بات لکھی جا چکی ہے، کہ جہاد بالسیف ایک اہم ضرورت کے سبب فرض قرار دیا گیا ہے، اور اس کی فرضیت اسی ضرورت کے ساتھ گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے یعنی ضرورت کی شدت اور کمی کے اعتبار سے وجوب کی نوعیت بدل جاتی ہے،

الجہاد فرض علی الکفایۃ اذا قام بہ فریق من الناس سقط عن الباقین وان لم یقم بہ احد اثم جمیع الناس لان الوجوب علی الکل	جہاد فرض کفایہ ہے، اگر مسلمانوں کا ایک گروہ اس فرض کو ادا کر رہا ہو تو دوسرے مسلمانوں سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی بھی فریضہ کو ادا نہ کر رہا ہو تو تمام مسلمان گنہ گار ہوں گے کیوں کہ اس کا وجوب سب پر ہے،

صاحب ہدایہ نے جامع الصغیر سے امام محمد کا قول نقل کیا ہے:-

الجهاد واجب إلا أن المسلمين في سعة حتى يحتاج إليهم	جہاد واجب ہے مگر تمام مسلمانوں کو اس وقت تک رخصت ہے جبتک کہ ان کی طرف احتیاج نہ ہو

یہ قول نقل کرنے کے بعد صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:-

فاول هذا الكلام إشارة إلى الوجوب على الكفاية وآخره إلى النفير العام وهذا لأن المقصود عند ذلك لا يحصل إلا بإقامة الكل فيفترض على الكل (هداية كتاب السير)	کلام کا ابتدائی حصہ وجوب علی الکفایہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور آخری حصہ نفیر عام کی طرف! اور نفیر عام کے وقت چونکہ تمام مسلمانوں کے سوا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس لیے اس حالت میں سب پر فرض عین ہوگا

حاصل یہ ہے، کہ اگر مسلمانوں کی ایک جماعت اعداء دین کے مقابلہ ودفاع کے لیے کافی ہے، تو تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین نہیں ہے، لیکن وہ جماعت اگر اس کام کے لیے کافی نہیں ہے، تو ان سے قریبی جگہ کے رہنے والے مسلمانوں پر فرض عین ہو جاتا ہے اور اس طرح جہاد کا دائرہ فرضیت وسیع ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ شرق وغرب کے تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے، چنانچہ صاحب نہایہ نے ذخیرہ سے نقل کیا ہے،

إن الجهاد إذا جاء النفير إنما يصير فرض عين على من يقرب من العدو وأما من وراءهم	نفیر (حملۂ اعداء) کے وقت ان لوگوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے جو دشمن سے قریب ہیں، اور جو لوگ دور ہیں، ان پر

البعد من العدو فهو فرض كفاية
عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم
يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان
عجز من كان يقرب من العدو عن
المقاومة مع العدو او لم يعجزوا
عنها ولكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا
فانه يفترض على من يليهم فرض
عين كالصلوة والصوم لا يسعهم
تركه ثم وثم الى ان يفترض على
جميع اهل الاسلام شرقا وغربا
على التدريج (شامی جلد ۳ ص ۲۳۸)

فرض کفایہ ہے مگر یہ فرضیت علی الکفایہ
اسی وقت تک ہے کہ ان کی ضرورت
نہ ہو اور اگر ان کی ضرورت ہو بایں طور
کہ قریب میں رہنے والے لوگ مقابلہ
اعداء کی قدرت نہ رکھتے ہوں یا فریضہ
جہاد کے قیام میں سستی اور کاہلی کرتے
ہوں تو اس صورت میں ان سے قریب رہنے
والے مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے
جیسے نماز اور روزہ فرض ہیں اور اسی
طرح تدریجاً شرق و غرب کے تمام اہل
اسلام پر فرض ہو جاتا ہے،

اسی طرح صنائع اور بدائع میں لکھا ہے،

اما اذا عم النفير بان هجم العدو
على بلد فهو فرض عين يفترض
على كل واحد من احاد المسلمين
ممن هو قادر عليه اذا عم النفير
لا يتحقق القيام به الا بالكل فبقي
فرضا على الكل عينا بمنزلة الصوم
والصلوة فيخرج العبد بغير اذن

جب کسی ملک پر دشمن حملہ آور ہو تو ہر اس
مسلمان پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے جو
قدرت جہاد رکھتا ہو پس جب نفیر عام
ہو اور اس کا قیام تمام مسلمانوں کے سوا ممکن
نہ ہو تو نماز اور روزہ کی طرح سب پر
جہاد فرض عین ہوگا، پس غلام کو آقا کی
اجازت کے بغیر اور عورت کو شوہر کی

ولا ہ والمرأۃ بغیر اذن زوجہا
لان منافع العبد والمرأۃ فی حق
العبادات المفروضۃ عینا مستثنا ۃ
عن ملک المولی والزوج شرعا
کما فی الصوم والصلوٰۃ وکذا
یباح للولد ان یخرج بغیر اذن
والدیہ لان حق الوالدین لا
یظہر فی فروض الاعیان

اجازت کے بغیر ہی جہاد کے لیے نکلنا
چاہیئے کیونکہ غلام اور بیوی کے منافع
فرض عین عبادات کے سلسلہ میں آقا
اور شوہر کے ملک سے شرعاً مستثنیٰ ہیں
جیسے نماز اور روزہ میں! اور اسی طرح
بیٹے کے لیے جائز ہے کہ وہ والدین کی
اجازت کے سوا ہی جہاد کے لیے نکل
کھڑا ہو کیونکہ والدین کا حق ان عبادات
پر اثر انداز نہیں ہوتا جو فرض عین ہیں،

عشقِ الٰہی کی دشوار اور کٹھن منزل

عشق بازی را تحمل باید اے دل خشمناز   گر بلائے بود بود و گر جفائے رفت رفت

جہادِ عشقِ الٰہی کی ایک کٹھن اور دشوار گذار منزل ہے اس میں رب العزت
سے جو پیمانِ محبت و وفا باندھا جاتا ہے اس میں سب سے پہلے ہر اس چیز کی
قربانی شامل ہے جو اُن کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب ہے،

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ
وَيُقْتَلُوْنَ (التوبۃ)

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے اُنکی جانیں اور
اُنکے مال جنت کے عوض میں خرید لیے ہیں
یہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں پس اہل
کفر کو قتل کرتے ہیں اور انکے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں

قُلْ إِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَ
إِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ
وَأَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ
أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ
جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى
يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ (التوبۃ)

اے نبی آپ مسلمانوں سے کہدیں اگر تمہارے
باپ تمہارے بیٹے تمہارے بھائی تمہاری
بیویاں تمہارے عزیز رشتہ دار اور وہ مال
جنکو تم نے محنت سے حاصل کیا ہے اور تجارت
جس کے خسارہ و نقصان سے تم ڈرتے ہو اور
وہ مکانات جنکو تم پسند کرتے ہو ان چیزوں
میں سے کوئی چیز اللہ سے رسول اور اسکی

راہ میں جہاد کی نسبت محبوب ہے تو تربص اختیار کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنا امر عذاب نازل کرے،

عافیت کوش اور تعیش پسند طبائع جہاد سے اس لیے بھاگتی ہیں کہ اس میں ان کو جان و مال کی تباہی نظر آتی ہے، مگر بازار محبت میں اس جنس عزیز کے سوا کسی چیز کی قیمت نہیں ہے، اور اس راہ میں انسان سے ان ہی چیزوں کی قربانی کا مطالبہ کیا جاتا ہے ؎

ترک جان و ترک مال و ترک سر　　در طریق عشق اوّل منزل است

اور عجیب تر بات یہ ہے کہ بادۂ عشق کے سرمستوں کے لیے یہی مطالبہ ہر مطالبہ سے آسان تر ہے،

تمنت سلیمی ان نموت بحبہا　　واھون شیء عندنا ما تمنت

محبوبہ کی خواہش یہ ہے کہ ہم اس کی محبت میں جان دے دیں، اور اس کی اس خواہش کی تعمیل ہمارے نزدیک سب سے زیادہ آسان ہے

جو لوگ عشق الٰہی کی لذت سے ناآشنا ہیں، وہ تنہائی کی خاموش فضا کو میدان جنگ کے شور و ہنگامہ پر ترجیح دیتے ہیں، کہ ان کے ضعیف و ناتواں دل جہاد و قتال کی قیامت خیز ہولناکیوں کو برداشت ہی نہیں کر سکتے، اور وہ راہبانہ سکون بے حسی ہی میں اپنی نجات تصور کرتے ہیں، مگر مرد مجاہد کا نشتر ان آسائش اور جمود کی زندگی کو لعنت سمجھتا ہے ؎

سکون پرستی راہب سے فقر ہے بیزار　　فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

بلکہ مجاہد کا نعرہ عریاں کائنات مادی میں ارتعاش پیدا کرتا ہے اور محفل زندگی کا سوز و ساز اسی کی بدولت ہے ؎

فقر چوں عریاں شود زیر سپہر | از نہیب او بلرزد ماہ و مہر!
فقر عریاں گرمی بدر و حنین | فقر عریاں بانگ تکبیر حسینؓ

حقیقت یہ ہے، کہ انسان فطرتاً شدائد و مہالک زندگی سے نفرت کرتا ہے اور لذائذ و رغائب دنیوی سے انس رکھتا ہے، اس لیے اس کو جب کسی ایسے کام کے لیے پکارا جاتا ہے جس میں اس کی جان و مال کو خطرہ ہو تو وہ اپنے لیے فرار کی کوئی نہ کوئی راہ تلاش کرتا ہے، اور بلطائف الحیل اس خطرہ سے بچنے کی سعی کرتا ہے کیونکہ انسان سب سے زیادہ اپنی جان سے محبت کرتا ہے اور پھر اس کا سرمایہ زندگی مال اور اولاد ہیں، جو اس کی چاہتوں کے مرکز ہیں اور ان سے وہ راحت و آرام حاصل کرتا ہے اور انکے نقصان و ضیاع سے اس کی دنیا تاریک ہو جاتی ہے،

زمانہ رسالت میں ایسے لوگوں کی ایک جماعت موجود تھی، جو آنحضرت صلعم کی امامت میں نمازیں پڑھتے تھے، اور آپ کی مجالس وعظ میں شرکت کرتے تھے، مگر جب ان کو جہاد کے لیے پکارا جاتا تھا، تو کوئی بیماری کا عذر پیش کرتا، اور کوئی عدم استطاعت کا بہانہ بناتا تھا،

سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (التوبۃ)	وہ اللہ کی قسمیں کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم استطاعت رکھتے، تو آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے، وہ اپنے آپکو ہلاکت میں دھکیل رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں
رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ (التوبۃ)	انھوں نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ عورتوں کے ساتھ گھروں میں بیٹھ رہیں، پس ان

ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے اور وہ سمجھتے نہیں ،

یہ وہ لوگ ہیں جن کو قرآن حکیم نے منافقین کے نام سے موسوم کیا ہے
مگر زمانہ حاضر کے مسلمانوں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی بزدلانہ طبیعت
پر زہد و تقویٰ کا نقاب اوڑھے ہوئے ہیں، اور گوشہ تنہائی کی خلوت نشینی کو معراج
روحانیت سمجھتے ہیں، یا ان کی مجالس علمی میں سنن مستحبات پر بحث و مناظرہ کے معرکے
جاری رہتے ہیں مگر انھوں نے اس سنت نبوی کا کبھی نام تک نہیں لیا کہ آنحضرت
صلعم میدان جنگ میں زرہ کیسے پہنتے تھے کون سے اسلحہ استعمال کرتے
تھے، دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے کیا کیا تدابیر سوچتے تھے اور دوران جہاد
میں عساکر اسلامی کی کس طرح قیادت فرماتے تھے۔

اور کچھ وہ اصحاب ثروت ہیں، جو نمائشی سخاوت و فیاضی سے اپنے
دل کو بہلاتے ہیں ، اور ایک بڑی تعداد ان مدعیان اقتدار و قیادت کی ہے جو
اسلام اور ملت کی خیر خواہی کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں۔ مگر ان کے دلوں کو ٹٹول کر
دیکھا جائے تو ایمان و یقین سے بالکل محروم اور بتان حرص و آز کے پجاری ہیں
ملت اور اسلام پر قیامت ٹوٹ رہی ہو، لاکھوں مسلمانوں کی لاشیں خاک و خون
میں تڑپ رہی ہوں، اور ان کی بہو بیٹیوں کی عصمت کو برسر عام رسوا کیا جا رہا
مگر خود غرض اور ہوس پرست مدعیان قیادت کو آپس کی جنگ اقتدار ہی
سے فرصت نہیں ملتی ؛

لا یصلح الناس فوضی لا سراۃ لھم ولا سراۃ لمن جھالھم سادوا

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ فریب نفس اور وسوسہ شیطانی ہے اور

اس بے حقیقت زہد و تقویٰ سے قیل و قال، نمائشی نیاز مندی اور خود غرضانہ ہنگامہ آرائی سے سیاست میں اسلام اور ملت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، البتہ کچھ دیر کے لیے یہ لوگ اپنے آپ کو دھوکے میں ڈال سکتے ہیں، یا چند دنوں کے لیے ان کی ہوس اقتدار کی تسکین ہو سکتی ہے، مگر ان لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے، کہ ان وساوس شیطانی کے ذریعہ دفاع ملک و ملت اور خدمت اسلام کا فریضہ ہرگز ادا نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی یہ جھوٹا اقتدار دیر تک قائم رہ سکتا ہے، اگر آپ کو زندہ رہنا مقصود ہے، تو زندگی کے حقائق کی جانب نظر اٹھائیے اور حقائق کا مقابلہ کیجیے

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر ۔۔۔ تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام ۔۔۔ میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر اعمال خیر کی اہمیت و تقدس سے کسی کو انکار نہیں ہے، بعد اپنی اپنی جگہ یہ سب ضروری اور واجب العمل ہیں، لیکن ان اعمال و فرائض کا آزادانہ عمل کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ ملت کا نظام آزاد اور مختار ہو، ا نظام ملت ہر طرح کے فساد و اختلال سے محفوظ ہو، مگر جب ملت ہر طرف سے خطرات و مصائب میں گھری ہوئی ہو، اور اغیار کی طرف سے مسلمانوں کی حریت و آزادی کو کچلنے کی مسلسل ریشہ دوانیاں جاری ہوں، تو ایسے حالات میں سب سے بڑا کار ثواب اور سب سے بڑی نیکی یہ ہے، کہ ملت کا ہر فرد ملت اور اسلام کے دفاع کے لیے نکل کھڑا ہو، اور اس کے ذہنی، فکری اور عملی قویٰ استحکام ملت کے لیے وقف ہو جائیں، اور ایسی حالت میں وہ بڑی سے بڑی عبادت جو مسلمان کو

اس فریضہ اولیٰ سے روکتی ہے حقیقت میں عبادت نہیں بلکہ فریب نفس ہے اور نیز وقت میں عمر صرف ہو جائے لوگ نجات و فلاح اور سعادت اخروی کے مستحق ہیں جو اپنے تمام وسائل و جان کے ساتھ جہاد کے لیے کمر بستہ ہوں

لٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ	لیکن رسول اور اہل ایمان اپنے مال و جان
جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ	کے ذریعہ جہاد کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں
وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَٰئِكَ	جن کے لیے نیکیاں ہیں اور یہی لوگ فلاح
هُمُ الْمُفْلِحُونَ (التوبۃ)	پانے والے ہیں۔

اسی طرح علوم دینی کی اشاعت درس و تدریس اور تصنیف کتب بجائے خود ایک مقدس اور نیک کوشش ہے مگر اعداء دین کے حملہ و ہجوم کے وقت قلم اور ذخیرہ کتب سے دفاع ملت کا کام نہیں لیا جا سکتا۔

لا تنال بغیر السیف منزلۃ ولا ترد صدور الخیل بالکتب

ان اہل قلم کے ہاتھوں میں بجائے قلم کے قبضہ شمشیر ہونا چاہیے اور جو امام قال اللہ و قال الرسول کے لیے وقف ہیں ان کی صدائے تکبیر سے دشت و جبل گونج اٹھیں اور اہل خانقاہ خانقاہوں سے باہر آ کر شیوۂ منصور کی تجدید کریں

خوش سیرت آوازۂ منصور کہن شد من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

یہ جو کچھ لکھا گیا ہے آج کے مسلمانوں کے لیے یقیناً ایک نئی بات ہے مگر تاریخ اسلامی کے ہر دور میں اہل حدیث و فقہ اور اہل تصوف سے ایسے مردان حر کی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے جو مسند علمی اور مسند ہدایت و ارشاد کے ساتھ میدان جنگ کے شہسوار تھے۔

علامہ ابن تیمیہ کے تبحر علمی سے کون واقف نہیں ہے؟ اور انھوں نے اس دور کے شرک والحاد کے خلاف جو قلمی جہاد کیا، وہ ان کی مجددانہ جلالتِ شان ہی کا حصہ تھا، اسلام کے اس جلیل القدر مفسر قرآن نے کتاب وسنت کے غوامض واسرار کو بے نقاب کیا، اور اس سلسلہ میں سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں، مگر جب ملت اسلامیہ پر تاتاریوں نے یورش کی اور ان کے وحشیانہ مظالم سے دنیا چیخ اٹھی، تو علامہ موصوف ایک بے خوف اور نڈر مجاہد کی حیثیت سے جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوئے، ۷۰۲ھ اور ۷۰۳ھ میں انھوں نے تاتاری فتنہ کے خلاف مسلسل جہاد بالسیف کیا،

علامہ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ قید وبند کے مصائب میں بسر ہوا، مگر اس حالت میں بھی انھوں نے قلمی جہاد کا سلسلہ جاری رکھا، اور بالآخر جیل خانہ ہی میں آپ کی وفات ہوئی، اور عجیب بات یہ ہے، کہ ان کے زمانہ حیات میں ایک دنیا ان کی مخالف تھی، مگر موت کے بعد دنیا سے اسلام کا ہر فرد ان کا ماتم گسار تھا اور ان کے صدمہ موت سے ہر آنکھ اشکبار تھی، جو زبانیں کل تک ان کی تکفیر کے لیے وقف تھیں، ان کی موت کے بعد وہ نوحہ سرائی میں مصروف تھیں ؎

مری وفات پہ کیوں مجھ کو رشک اہل وفا کہ اپنے مٹنے سے اہل وفا کا نام مٹا

عبد اللہ بن مبارک اپنے زمانہ کے مایہ ناز عالم متبحر اور امام حدیث تھے انھوں نے اپنی زندگی کا یہ دستور بنا رکھا تھا، کہ وہ ایک سال تجارت کرتے، ایک سال درس دیتے اور ایک سال جہاد میں شرکت فرماتے تھے، میدان جہاد سے انھوں نے اپنے زمانہ کے مشہور معروف عابد وزاہد فضیل بن عیاض کو خط لکھا جس میں یہ اشعار

مرقوم تھے،

یا عابد الحرمین لو ابصرتنا   لعلمت انك بالعبادۃ تلعب

اے حرمین کے عابد! اگر تو ہماری جانب نظر اٹھا کر دیکھے تو تجھے یقین ہو جائے کہ تو عبادت میں کھیل رہا ہے

من کان یخضب خدہٗ بدموعہ   فنحورنا بدمائنا تتخضب

جو شخص اپنے آنسوؤں سے اپنا رخسار تر کر رہا ہے وہ دیکھے کہ ہماری گردنیں خون سے رنگین ہیں

اسی طرح امام اعظم اور امام شافعی یکتائے روزگار فقیہ اور محدث تھے، اور زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے، ان کے علمی کارناموں پر ملت اسلامی تا قیامت فخر کرتی رہے گی، انہوں نے اپنی زندگی علمی جہاد کے لیے وقف کر رکھی تھی مگر جب مدینہ منورہ میں حضرت امام حسن کے پڑپوتے محمد مہدی نے خلافت کا دعویٰ کیا، اور منصور عباسی کی ایک بھاری فوج نے مدینہ منورہ پر چڑھائی کی، تو ان جلیل القدر ائمہ نے محمد مہدی کی حمایت میں تلوار اٹھائی، اور اس کے بعد ایک مدت تک ان پر عتاب "ملوک" کا سلسلہ جاری رہا

جہاد کا تصورِ مطلق

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے جہاد کا ایک محدود تصور ہی سامنے آسکا ہے، اور حقیقت یہ ہے، کہ جہاد کا لفظ صرف قتال بالکفار ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس سے وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے، کہ جہاد ایک دائم اور مسلسل حقیقت ہے اور اس کو ہر زمانہ میں جاری رکھنا ضروری ہے، مگر ظاہر ہے، کہ قتال بالکفار کا عمل ہر دور میں جاری نہیں رہ سکتا، اس کے خاص اسباب و داعیات ہیں، اور ان اسباب و داعیات کے بروئے کار آنے کے بعد ہی قتال بالکفار کی ضرورت پڑتی ہے اور جب تک مخصوص اسباب معرضِ وجود میں نہ آئیں اس وقت تک جہاد بالسیف نہ صرف غیر ضروری بلکہ بعض حالات میں مصالح ملت کے لیے سخت مضرت رساں ہوتا ہے اور گاہے ایسے حالات بھی پیش آسکتے ہیں کہ داعیاتِ قتال کے موجود ہونے کے باوجود ملت اسلامیہ کی دور اندیشانہ مصلحت جنگ و قتال کے بجائے معاہدۂ صلح کی متقاضی ہوتی ہے، مگر جہاں تک جہاد کے تصورِ مطلق کا تعلق ہے وہ اس حالت میں بھی بدستور کارفرما رہتا ہے، بہرحال ملت کے مخصوص سیاسی اور ملی مصالح، ماحول اور وقت کے مقتضیات اور زندگی کے مختلف شعبوں کے اقتضاء کی رعایت کے اعتبار سے جہاد کا عمومی تصور اب تک تشنہ بحث ہے، چنانچہ عنوان بالا کے تحت ذیل کے امور بحث و نظر کے محتاج ہیں،

حالات و مصالح کے ساتھ جہاد کی ہیئت بدل سکتی ہے یا نہیں، اگر بدل سکتی ہے تو اس تبدیلی کے اصول کلیہ کیا ہیں؟ معاشرے کے مختلف شعبوں اور جہد میں کس نسبت کیا ہے؟ نیز اجتماعی، دینی فرائض بھی جہاد کے وسیع مفہوم میں آسکتے ہیں

حالات، مصالح اور جہاد

ہر زمانے کے مخصوص حالات اور ہر دور کے متعین مصالح کا احاطہ و استیعاب کسی طرح ممکن نہیں ہے مگر کتاب اللہ و اعمال رسالت سے عمومی کلیہ و استنباط کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حکومت اسلامیہ کو خارجی پالیسی کے تحت ذیل کے حالات پیش آسکتے ہیں اور ان حالات کے پیش نظر اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے لیے راہ عمل متعین کرے۔

(۱) اہل کفر ایسے اعمال کا ارتکاب کریں جو جہاد بالسیف کے محرک بن سکتے ہیں مثلاً وہ مسلمانوں سے کیے گئے معاہدہ کو توڑ ڈالیں یا ان کے ملک میں رہنے والے مسلمانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو ان کے دست تعدی سے محفوظ نہ ہو یعنی مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کو مشق ستم بنایا جا رہا ہو یا انھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا ہو یا ان کے ملک میں دعوت اسلامی پر پابندیاں مثلاً عائد کی ہوں یا یہ تمام باتیں موجود ہوں یا ان میں سے کوئی ایک بھی پائی جاتی ہو اور اس کے علاوہ حکومت سابقہ قوت و شوکت کے پیش نظر ان امور کے دفعیہ کی [illegible] قوت رکھتی ہو، تو اس حالت میں حکومت اسلامی کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں سے [illegible] اعلان جنگ کرے۔

وَإِن نَّكَثُوا أَيْمَانَهُم مِّن بَعْدِ عَهْدِهِمْ   اگر وہ عہد کرنے کے بعد قسم کو توڑ ڈالیں اور

اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز (حج) — ذریعہ ظلم اور بدکردار لوگوں کی شرارت سے دوسروں کی مدافعت نہ کرتا تو خانقاہیں گرجے عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے منہدم کر دی جاتیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اللہ کے دین کی مدد کرتے ہیں۔

واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد من القتل۔ — تم ان کافروں کو وہاں سے نکال دو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے اور فتنہ قتل سے سخت ہے

ان آیات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورہ حالات میں حکومت اسلامیہ کے لیے فوجی اقدام از بس ضروری ہے اور اس فریضہ سے پہلو تہی کرنے کی اس کو قطعاً اجازت نہیں ہے۔

(۲) اہل کفر مرکز اسلامی پر حملہ آور ہوں اور مسلمان ان کے مقابلہ و دفاع کی قدرت رکھتے ہوں۔ اس حالت میں ضروری ہے کہ مسلمانوں کا ہر فرد جہاد و قتال کے لیے نکل کھڑا ہو اور مرکز اسلامی کو بچانے میں پوری طاقت صرف کی جائے

قسم اول و دوم میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم میں جہاد کی نوعیت حملہ و ہجوم کی ہے اور دوسری قسم میں دفاع کی نیز پہلی صورت میں جہاد فرض علی الکفایہ ہے اور بہت سے لوگ شرکت جہاد سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں مگر دوسری صورت میں شرکت قتال بلا استثناء تمام مسلمانوں پر فرض عین ہے۔

(۳) اہل کفر مسلمانوں کے مقابلہ سے عاجز آ کر مصالحت کی درخواست کریں اس صورت میں حکومت اسلامی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کی درخواست قبول کر لے خواہ اس میں اہل کفر کی نیت بد ہو [illegible] کی وجہ یہ ہے کہ [illegible] قرآن [illegible] نہیں آئی ہے۔

بالیقین ایک بلند اور پاکیزہ مقصد کے لیے فرض کیا گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ جنگ کی نسبت مصالحت کی صورت میں یہ مقصد بحسن طریقہ حاصل ہو چنانچہ قرآن حکیم نے اس صورت کے لیے واضح حکم دیا ہے۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لها و	اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو آپ ان کی درخواست
وتوکل علی اللہ (انفال)	صلح کو قبول کریں اور اللہ پر توکل کریں

(۴) کفار کی قوت و شوکت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طاقت اس حد تک کمزور ہے کہ جنگ کی صورت میں اس بات کا اندیشہ ہو کہ سرے سے مرکزیت اسلامی ختم ہو جائیگی مسلمانوں کی طاقت پراگندہ ہو جائیگی اور ہمیشہ کے لیے کفر غالب آ جائیگا تو اس حالت میں مسلمانوں کو کمزور فریق کی حیثیت سے ہی مصالحت کر لینی چاہیئے کیوں کہ جنگ کی صورت میں جو نقصان عظیم اٹھانا پڑے گا اس کی نسبت مصالحت کا ضرر کم ہے یہ ایک مسلم اصول ہے کہ دو برائیوں سے جس کا ضرر کم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیئے، چنانچہ صلح حدیبیہ کے واقعہ میں یہی اصل کارفرما نظر آتی ہے اور قرآن حکیم نے اس صلح حدیبیہ کو جس میں مسلمانوں کی حیثیت کمزور ترین مخلوق کی تھی نتائج کے اعتبار سے 'فتح مبین' قرار دیا ہے اس صورت میں ضروری ہے کہ مصالحت کے بعد ذہنی اور عملی قوی کی تنظیم و تربیت اور مادی ذرائع کی فراہمی کے لیے پوری قوت صرف کی جائے

(۵) مسلمانوں کی باقاعدہ تنظیم اور مرکزیت موجود نہ ہو اور کفر کا غلبہ ہو اس حالت میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ذہنی تربیت و اصلاح، تطہیر فکر اور تعمیر فکر کے بعد مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور آزاد مرکز کے قیام کے لیے، اصول حکمت کے تحت جدوجہد کی جائے چنانچہ مسلمانوں کی مکی زندگی، ہجرت مدینہ اور مدینہ منورہ میں اسلامی مرکز کے قیام تک

کام کی نوعیت اصلاحی و تعمیری تھی اور اس کے مرکز اسلامی کے استحکام کا کام اصول حکمت کے تحت تدریجی ارتقاء کے ساتھ جاری رہا۔

شریعتِ حقہ اور قیام مصالح

یہ حقیقت ہے کہ شریعت اسلامیہ سراپا حکمت و دانش اور مصالح عامہ پر مبنی ہے اس کے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی دور رس اندیشانہ مصلحت موجود ہے یعنی یہ مصلحت مصلحت عاجلہ نہیں ہے بلکہ انسان کی حیات میں یعنی دنیوی اور اخروی زندگی کی فلاح و نجات کی ضامن ہے

ہم احکام شریعت پر جس قدر غور و فکر کرتے ہیں اتنا ہی ہمارے ایمان میں پختگی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور ہمارا یہ یقین زیادہ مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے کہ آج جس قدر ہمارے اجتماعی اور ملی امور میں ضعف و انتشار رونما ہوتا ہے اور ہر لحظہ مصائب میں اضافہ ہو رہا ہے وہ قطعی طور پر مصالح شریعت سے مجرمانہ غفلت و اعراض کا نتیجہ ہے یعنی شریعت نے احوال و ظروف اور مصالح ملی کے اعتبار سے مختلف حالتوں کے لیے جدا جدا حکیمانہ احکام صادر کیے ہیں جن پر عمل کرنے سے ملت اسلامیہ کو نہ صرف یہ کہ تمام مفاسد و مصائب سے نجات مل سکتی ہے بلکہ حقیقی فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکتی ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ ان شرعی مصالح کے قیام سے خود مسلمانوں نے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے حالات زمانہ کے تغیر کے لحاظ سے جو مخصوص حکم و مصالح شریعت نے متعین کیے تھے ان کے مقابلہ میں مسلمانوں نے ہمیشہ مفادات جزئیہ اور اغراض عاجلہ کو ترجیح دی ہے تحبون العاجلة وتذرون الآخرة

مسلمانوں کے قومی کردار کا تاریخی جائزہ

آج عالم اسلامی خوف و رجاء اور امید و بیم کے جس دور سے

پر گھڑا ہے اس کا تاریخی پس منظر معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے، اس موقع پر اسلام کے اجتماعی اور ملی احکام کی روشنی میں مسلمانوں کے قومی کردار کا جائزہ لینا ضروری ہے،

اسلام نے شیرازہ ملت اور مرکزیت اسلامی کے تحفظ و احترام کی جس شدت سے تاکید کی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خدا اور رسول کے نزدیک تنظیم ملی اور استحکام مرکز تمام دوسرے اجتماعی امور سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، قرآن حکیم نے مرکز ملت (خلیفہ) کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور احادیث میں مسلمانوں کو واشگاف الفاظ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ امراء کے مظالم اور فسق و معصیت کو برداشت کر لیں، لیکن ان پر خروج نہ کریں، کیونکہ ظلم اور معصیت اگرچہ بذات خود "المنکر" میں شامل ہیں، اور منکر کا انکار بجائے خود ایک اہم فریضہ ملی ہے، مگر ایسے امراء کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے سے جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں وہ متذکرہ امور سے زیادہ خطرناک ہیں یعنی ظالم امراء کی ناراضی اطاعت میں کم از کم مرکزیت محفوظ رہے گی، قوانین شرعیہ نافذ رہیں گے لیکن عدم اطاعت کی صورت میں مرکزیت کی بربادی، قوانین شرعیہ کے تعطل اور کفر کے دائمی غلبہ کا امکان زیادہ قوی ہے، اس بناء پر شارع علیہ السلام نے حکم دیا ہے کہ ہر حال میں امراء کی اطاعت کی جائے، اور مرکز ملی کو تباہی سے بچایا جائے چنانچہ کچھ صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدیانت اور ظالم امراء کی نسبت یہ سوال کیا افلا نقاتلھم کیا ہم ان سے جنگ کریں؟ اس کے جواب میں آنحضرت صلعم نے فرمایا، لا ما اقاموا الصلوٰۃ - ہرگز نہیں، جب تک کہ وہ تم میں نمازیں پڑھتے رہیں،

ایک دوسرے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا

من رای من امیرہ ما یکرھہ فلیصبر — جب تم میں سے کوئی شخص اپنے امیر کی برائی دیکھے

ولا ينزعن يدا من طاعة   تو اسے صبر کرنا چاہیے اور طاعت سے ہاتھ نہیں کھینچنا چاہیے۔

علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:-

ومن تامل ما جرى على الاسلام في	اسلام پر جو چھوٹے بڑے فتنے نازل ہوئے ہیں
الفتن الكبار والصغار رآها من اضاعة	ان پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ وہ اس اصل
هذا الاصل وعدم الصبر على	کے ضائع کرنے اور منکر پر صبر نہ کرنے سے پیدا
منكر فطلب ازالته فتولد منه ما	ہوئے ہیں، برائی کو مٹانے کی کوشش کی گئی اور
هو اكبر منه	اس کے نتیجہ میں اس سے بہت بڑی برائی سامنے آگئی

بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، آج سے کچھ عرصہ پہلے تمام عالم اسلامی عثمانی مرکز خلافت کے ساتھ وابستہ تھا، اگرچہ یہ وابستگی محض برائے نام رہ گئی تھی مگر کم از کم اس میں یہ گیر اتحاد اسلامی کی ہیئت تو بڑی حد تک منضبط کر رکھی تھی، اپنی تمام دنیائے اسلام میں قیادت عثمانی تسلیم کی جاتی تھی، اور ترکی مملکت بذات خود کرہ ارضی کے بہت بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن عیسائی اقوام نے جب متحد ہو کر اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے، تو سب سے پہلے انہوں نے ممالک عربیہ میں وطنی اور قومی عصبیت کے جذبات ابھارنے اور ان کو ترکوں کے خلاف آمادہ بغاوت کرنے کی مہم شروع کی، عرب ممالک ان کے فریب میں آگئے اور انہوں نے اعداء دین سے مل کر اتحاد اسلامی کے ٹکڑے کر دیئے، قومی عصبیت نے ان

ل اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ برائی کو برائی نہ کہا جائے یا اس کی اصلاح کے لیے تعمیری جدوجہد نہ کی جائے، مطلب صرف یہ ہے کہ ایسے امراء پر خروج نہ کیا جائے اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے مسلمانوں کی جمعیت میں انتشار پیدا ہو، جہاں تک فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا تعلق ہے، وہ کسی حال میں پس انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کو یہ سوچنے کا موقع نہ دیا کہ حضرت محمدؐ کے دین میں عرب اور غیر عرب کی کوئی تمیز نہیں
ہے۔ پوری ملت کی منفعت اور نقصان ایک ہے مسلمانان دنیا کی بہتری اسی میں
ہے کہ وہ اخوت اسلامی کے رشتے کے مقابلہ میں تمام دوسرے رشتوں کو توڑ ڈالیں
مگر مسلمان دین حجازی کی اس اٹل حقیقت کو بہت پہلے سے فراموش کر چکے تھے،
اور اب اغیار کے اشارہ ہائے ابرو پر ناچنا شروع کر دیا تھا، بالآخر کیا ہوا خلافت
عثمانی ختم ہو گئی، اتحاد اسلامی پارہ پارہ ہو گیا، اور قریب قریب پوری اسلامی دنیا پر عیسائیت
کی سیادت قائم ہو گئی اور تمام اسلامی ممالک کو محکومیت کا طوق ذلت پہننا پڑا

آج ممالک اسلامیہ کی حالت یہ ہے، کہ اگرچہ وہ ایک حد تک آزاد ہیں مگر اس
قدر مجبور و بے بس ہیں، کہ بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک کا سہارا لیے بغیر ایک قدم
بھی نہیں چل سکتے حالانکہ مسلمانان عالم تعداد جغرافی محل وقوع اور قدرتی ذرائع پیداوار
کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ ان کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت تسلیم کیا جاتا۔ مگر
حال ہی میں صیہونیت کے مقابلہ میں ان کا سیاسی موقف اور بے شعوری ساری دنیا نے
دیکھ لی ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ؎

(اقبال)

تا شعار مصطفیٰ از دست رفت — قوم را رمز بقا از دست رفت

ترکوں نے اس کے بعد جو راہ عمل اختیار کی اور بد قسمتی سے آج تک اسی راہ پر گامزن
ہیں وہ بھی یقیناً ہلاکت کی راہ ہے یعنی وہ محدود وطنیت میں سمٹ کر رہ گئے ہیں،
حالانکہ مسلمان عالم انسانی کی امارت کے لیے پیدا ہوا ہے، ؎

تو اے شاہیں نشیمن در چمن کردی ازاں ترسم — ہوائے او بہ بال تو دہد پرواز کوتاہی

اور اس سے شدید تر مصیبت یہ ہے کہ وہ ذہنی اور عملی طور پر اب بھی طلسم فرنگ

سخن ہائے ایں ست

دینداری کہ رست شد بہر رنگ — بجز فنا اندر طلسم زر اسیر است (اقبال)

گزشتہ ڈیڑھ صدی سے ہندوستانی مسلمانوں کو جن روح فرسا مصائب و آلام سے گزرنا پڑا ہے وہ بھی درحقیقت ان کی حقائق فراموشی ہی کا نتیجہ ہیں۔ ان کا ملّی شعور اور قومی کردار اس قدر پست ہو چکا تھا کہ وہ دنیائے سیاست میں تعبّد محکومیت کی ذلت ہی کے سزاوار تھے اور قدرت کا کام یہ نہیں ہے کہ محض کسی نسبت کی بنا پر کسی قوم سے رعایتی سلوک کرے، چنانچہ ان سے وہی سلوک کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔

جدوجہد آزادی میں انہوں نے جو راہیں اختیار کیں، وہ بھی اصول حکمت کے سراسر خلاف تھیں۔ جس چیز پر سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی اس کو سب سے پیچھے ڈال دیا گیا یعنی محکومیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے کتاب و سنّت سے روشنی حاصل کرنی چاہیے تھی، اور بجائے ہنگامہ ہائے سیاست کے فکر و ذہن کی تطہیر و تعمیر کا کام سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا اور آج قیام پاکستان کے بعد اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ دیانت داری کا فقدان، مردان کار کی قلت، اغراض فاسدہ کا بے پناہ ہیجان، عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی فسق و معصیت کی تباہ کاری اور اس طرح کے دیگر مفاسد طوفانی رفتار کے ساتھ ملک کے ہر حصہ میں پھیلتے جا رہے ہیں۔

فإن تنج منها تنج من ذي عظيمة — وإلا فإني لا إخالك ناجيا

یہ حقائق ہیں جو اس موضوع کے ضمن میں بے ساختہ زبان قلم پر آ گئے اور ہو سکتا ہے کہ اس سے کچھ دلوں کو ٹھیس لگے مگر جو واقعات آفتاب نصف النہار کی طرح آنکھوں کے

سامنے جلوہ گر ہیں وہ اگر قلم کی مدد سے صفحۂ قرطاس پر آ جائیں، تو اس میں آخر کیا مضائقہ ہے؟ اور اب وقت نہیں ہے کہ امت اسلامیہ کو حقائق زندگی سے بے خبر رکھا جائے۔

صد خرقہ ازیں بیش منافق نتواں بود　　خیزید وشں ازیں شیوۂ رندانہ نہادیم

مقدمات جہاد | موضوع کی دوسری شق یہ تھی کہ کیا دیگر اجتماعی اور ملی فرائض جہاد کے وسیع مفہوم میں شامل ہیں؟ سطور بالا میں کہا جا چکا ہے کہ حالات کے تغیر کے ساتھ امت کے مصالح بھی بدلتے رہتے ہیں اور ان مختلف حالات میں اقامت دین کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے وہ جہاد کے عام مفہوم میں داخل ہے، چنانچہ سمع وطاعت، تنظیم جماعت، ہجرت، انفاق فی سبیل اللہ، اسلحہ کی تیاری گھوڑوں کی پرورش، سد ثغور یعنی سرحدوں کو فوجی لحاظ سے مضبوط کرنا، علوم دینی، فنون حرب اور علوم طبعیہ کی تعلیم وا شاعت اور اس طرح کے تمام اجتماعی و ملی امور جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ رکھتے ہیں اور مقصد کے اعتبار سے جہاد کے عام تصور کے تحت آ تے ہیں۔ یہاں ان امور کو مقدمات جہاد کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ کتاب و سنت میں جہاد بالسیف کی طرح نہایت شدت کے ساتھ ان امور کی تاکید کی گئی ہے، ذیل میں ہم ان تمام امور کے لیے کتاب و سنت سے شہادتیں پیش کرتے، سمع و طاعت، نظم جماعت، ہجرت اور انفاق کے متعلق اس قدر قرآنی آیات اور احادیث نبوی وارد ہوئی ہیں کہ ان کا استیعاب مشکل ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَ لِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (الانفال)	اے ایمان والو! خدا اور رسول کی دعوت کو قبول کرو جبکہ وہ تم کو حیات بخش پیغام کی طرف پکاریں
وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا	تم اللہ کی رسی کو متحد ہو کر مضبوطی سے پکڑ لو اور

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران)

باہم تفرقہ نہ ڈالو اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پس اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت و الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے،

لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا (الآیۃ)

تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنہوں نے دین کے ٹکڑے کر دیے اور وہ گروہ گروہ بن گئے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (التوبۃ)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں مال و جان سے جہاد کیا اللہ کے نزدیک سب سے بڑا انعام پاتے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت، رضا اور ان جنات کی بشارت دیتا ہے جن میں دائمی نعمت و مسرت ہوگی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، بیشک اللہ کے نزدیک بہت بڑا اجر ہے،

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ)

اور تم اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو صاحب اقتدار ہوں ان کی اطاعت کرو

حضرت امام بخاری نے اس آیت کو عنوان باب قرار دیا ہے اور اس

کہ حسب ذیل کی حدیث صحیح کی ہے۔

من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی	جس نے میری طاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری طاعت کی

امام احمد کی مسند جد ذیل روایت زیادہ جامعیت رکھتی ہے۔

قال رسول اللہ صلعم وانا امرکم بخمس اللہ امرنی بھن الجماعۃ السمع والطاعۃ والہجرۃ والجہاد فی سبیل اللہ فانہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام عن عنقہ الا ان یراجع (احمد)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تکو پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے، التزام جماعت سمع وطاعت ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کیونکہ جو شخص ایک بالشت بھی جماعت سے نکل گیا، گویا اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے اتار دی بجز اس صورت میں جبکہ وہ پھر جماعت میں لوٹ آئے

دائرۂ اطاعت اس موقع پر اطاعت امیر کے صحیح تصور کی وضاحت کرنا ضروری ہے، کیونکہ آج دوسرے اسلامی مسائل کیطرح اطاعت امیر کے اسلامی تصور کو بھی مسخ کر دیا گیا ہے چنانچہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ امیر کی اطاعت ہر حال میں ضروری ہے اور اس سلسلے میں یہ دیکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ امیر دینی اور ملی مقاصد و مصالح کا علم رکھتا ہے یا نہیں اور وہ جو کچھ حکم دیتا ہے وہ کتاب وسنّت کے صریح احکام سے متصادم تو نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب وسنت نے اطاعت امیر پر جتنا زور دیا ہے اس

کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کے باوجود اسلام چونکہ قانون فطرت ہے اور اس
کے ہر حکم میں مصالح عباد کو ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ ان مصالح کے تحت
ہی اسلام نے انسانی زندگی کی قدریں متعین کی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اطاعت امیر
کے لیے شارع علیہ السلام نے حدود متعین کر دیے ہیں، اور ان حدود کے اندر رہتے
ہوئے ہی اس فریضہ دینی پر عمل کیا جا سکتا ہے، ورنہ اطاعت مطلقہ کی صورت میں
ہزاروں مفاسد رونما ہو سکتے ہیں،

اطاعت امیر ایک اسلامی فریضہ ہے، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ امیر
مسلمان ہو، نیز وہ مقاصد جہاد اور مصالح دینی سے باخبر ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ اس
کے ہر حکم کی تعمیل سے ایسے نتائج سامنے آئیں گے جو اسلامی اصول و مقاصد سے
متصادم ہوں گے، نیز امیر جو حکم دیتا ہے وہ کتاب اللہ کے احکام سے متصادم
نہ ہو ورنہ اس کی اطاعت قطعاً جائز نہیں ہے۔

الطاعة فی المعروف (بخاری)
اطاعت صرف نیک کام میں جائز ہے

لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق
کسی ایسی بات میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے جس میں خالق کی نافرمانی لازم آتی ہے

الرباط:- قرآن حکیم میں اس کے لیے واضح حکم موجود ہے،

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ (الانفال)

تم اپنی وسعت کے مطابق دشمن کے مقابلہ کیلئے اسلحہ و رباط الخیل کی تیاری کرو جس سے تم اللہ کے دشمن اپنے دشمن اور ان دوسروں کو مرعوب کر سکو جنکو تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے۔

اس آیت میں قوت سے مراد فن حرب کی مہارت ہے، چنانچہ احادیث صحیحہ میں قوۃ کی تفسیر ذیل کے الفاظ میں کی گئی ہے،

الا ان القوۃ الرمی — یاد رکھو کہ قوت تیر اندازی کا فن ہے،

اور رباط الخیل سے مراد ملک کی سرحدوں کو مضبوط کرنا ہے۔ احادیث نبوی میں اس کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

انہ خیر من الدنیا وما فیہا وانہ خیر من صیام شہر وقیامہ (حجۃ اللہ) — رباط دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے۔ رباط مہینہ بھر کے صیام و قیام سے بہتر ہے،

فنون حرب کی اشاعت و ترقی

محافظت خیل، تیر اندازی، آلات جہاد کی تیاری اور اس قسم کے دوسرے امور کی اسی طرح تاکید کی گئی ہے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم البرکۃ فی نواصی الخیل — گھوڑوں کے ناصیہ میں برکت رکھی گئی ہے،

وقال صلی اللہ علیہ وسلم الخیل معقود فی نواصیہا الخیر الی یوم القیمۃ الاجر والغنیمۃ (بخاری) — گھوڑوں کے نواصی میں قیامت تک خیر و برکت یعنی اجر و ثواب اور غنیمت پیوست کر دی گئی ہے،

ان اللہ یدخل بسہم الواحد ثلثۃ نفر الجنۃ صانعہ یحتسب فی صنعتہ والرامی بہ ومنبلہ (حجۃ اللہ البالغۃ) — اللہ تعالیٰ ایک تیر کے بدلہ میں تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ ایک تیر بنانے والا جو ثواب کے لیے بناتا ہے، دوسرا تیر چلانے والا، تیسرا اس کو دینے والا،

امام ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

ثم لما وجب الجهاد لاعلاء كلمة الحق وجب ما لا يكون الاعلاء الا به ولذلك كان سد الثغور وعرض المقاتلة ونصب الامراء على كل ناحية وثغر واجبا على الامام وسنة متواترة

(حجة الله البالغة ص۳۱)

جب جہاد کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لیے فرض ہوا ہے تو ہر وہ کام فرض ہوگا جس کے بغیر اعلائے دین کا مقصد حاصل نہیں ہوتا لہٰذا سرحدوں کو مضبوط کرنا، جنگ کی تیاری کرنا، اور ملک کی تمام سرحدوں پر امرا مقرر کرنا، امام پر نہایت ضروری ہے۔

مندرجہ بالا اصول کے تحت ہر وہ کوشش جو قتال فی سبیل اللہ کے لیے ناگزیر ہے وجوب کا درجہ رکھتی ہے اور جہاد کے تصور مطلق میں شامل ہے اور ظاہر ہے کہ متذکرہ امور کی طرح احکام شرعیہ اور علوم طبیعیہ کی اشاعت و ترقی بھی اس اصول کے تحت لازمی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے بار بار ان علوم کے سیکھنے کی ہدایت کی ہے، چنانچہ علوم دینیہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے،

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (الانفال)

مسلمانوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ سب کے سب جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں پس ایسا کیوں نہ ہو، کہ ہر فرقہ میں سے کچھ لوگ اس غرض سے نکلیں کہ وہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور تاکہ وہ واپس آکر اپنی قوم کو ڈرائیں شاید کہ وہ لوگ ڈرنے لگیں،

علوم طبعیہ میں مہارت پیدا کرنے کی خاطر قرآن کریم ہر جگہ کارخانہ قدرت میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے،

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران)

بے شک، آسمانوں، زمین اور دن رات کے اختلاف میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں (یہ عقلمند) وہ لوگ ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹنے کی حالتوں میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی پیدائش میں غور و تدبر کرتے ہیں (اور وہ کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار تونے اس عجیب غریب کارخانہ دنیا کو یونہی بے مقصد نہیں بنایا تو پاک ہے پس ہم کو عذاب دوزخ سے بچا